مصطفی مستور

خدا کا چاند سا چہرہ چوم لو

فارسی سے ترجمہ

احمد شہریار

خدا کا چاند سا چہرہ چوم لو!

(ایرانی ناول)

مصطفیٰ مستور

فارسی سے ترجمہ

احمد شہریار

مہردر

انیس نوئم

۱

میں گلابی رنگ کے آرکڈز کا ایک گلدستہ خرید کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیتا ہوں۔ ایئر پورٹ پہنچتا ہوں۔ وہاں دور افق کے نزدیک سورج کی آخری کرنیں کرج کی تارکول شدہ زمین پر دم توڑ رہی ہیں۔ نو سال پہلے جب مہرداد امریکہ چلا گیا، تب ہمیں تہران یونیورسٹی میں فلسفے میں داخلہ لیے دو سال ہو رہے تھے۔ مہرداد نے اپنے پین فرینڈ سے اس قدر خط و کتابت کی کہ اس پر دل و جاں سے فدا ہو گیا۔ پڑھائی ادھوری چھوڑ کر اس کے پاس امریکہ چلا گیا۔ مجھے مہرداد کو بھولے زمانے ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب اس کی والدہ نے فون کر کے کہا میں اسے لینے ایئر پورٹ چلا جاؤں تو اس کا حلیہ یاد کرنے کے لیے مجھے اپنے ذہن پر کافی زور دینا پڑا تھا۔ میں گاڑی ہائی وے سے ایئر پورٹ روڈ کی طرف گھماتا ہوں اور اسکول کی یادیں خواہ مخواہ میرے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہیں؛ وہی لکڑی کا ڈیسک جس پر میں اور مہرداد بیٹھتے تھے اور جو ان اشعار سے بھرا ہوا تھا جنھیں اس نے عباس سے لیے ہوئے چاقو سے اس پر کندہ کیا تھا۔ ان میں زیادہ تر حافظ کی عشقیہ شاعری ہوتی تھی؛ وہ حافظ جس کا سرے سے کوئی مجازی محبوبہ تھی ہی نہیں۔ مہرداد کبھی بھی کسی مجازی محبوبہ کے لیے یہ شعر میز پر کندہ نہیں کرتا تھا۔ اس کا سارا عشق خیالی نوعیت کا تھا اور یہ بات صرف مجھے معلوم تھی۔ کلاس کے باقی اسٹوڈنس سمجھتے تھے کہ اس کے کئی لڑکیوں سے چکر چل رہے ہیں لیکن میں

جانتا تھا کہ مہرداد میں کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات نہیں تھی، اس سے عشق لڑانا تو دور کی بات ہے۔ تاہم اس نے جولیا (اپنی امریکی محبوبہ) میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا کہ اس پر مرمٹا تھا؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔

آخری دنوں میں اس نے خود بھی شاعری شروع کی تھی۔ اپنی شاعری بابک نامی لڑکے کو دے کر اس کی منتیں کرتا تھا کہ وہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرے کیونکہ بابک کی انگریزی ہم سب سے اچھی تھی۔ یہ ترجمہ وہ جولیا کو پوسٹ کرتا تھا۔ ایک بار جب وہ میز پر چاقو سے ایک شعر کندہ کر رہا تھا تو کوہی صاحب (ہمارے ریاضی کے استاد) نے اسے ایسا کرتے دیکھ لیا۔ پہلے تو اس کی طرف چاک کا ٹکڑا اچھالا اور پھر خود غصے سے اس کی طرف بڑھا۔ مہرداد نے فوراً اپنی کاپی اس کندہ شدہ عبارت پر رکھی تا کہ کوہی صاحب اس کا لکھا نہ پڑھ سکیں۔ لیکن جب استاد نے مہرداد کی کاپی لے کر اس سے مہرداد کو پیٹا اور پھر ذلیل کر کے کلاس سے باہر نکالا تو لڑکوں نے اس کی کندہ کی ہوئی تحریر پڑھی۔ اس نے نہایت بری لکھائی میں لکھا تھا: I Love You

ویٹنگ روم کے اسپیکروں سے ایک نسوانی آواز گونجتی ہے: برٹش ایرویز فلائٹ نمبر ۱۳۵۲ اگلے چند منٹ تک مہرآباد انٹرنیشنل ایرپورٹ پر لینڈ کرنے والی ہے/ فرنکفرٹ جانے والی فلائٹ نمبر ۱۹۴۱ کے مسافرین بورڈنگ پاس حاصل کرنے کے لیے گیٹ نمبر چھ سے رجوع کریں/ ایتھنز جانے والی فلائٹ نمبر ۵۱۱ کے مسافروں سے آخری بار گزارش کی جاتی ہے کہ جہاز میں سوار ہونے کے لیے گیٹ نمبر تین سے رجوع کریں۔

اُف اتنے سارے لوگ! اتنی بھیڑ میں پھنس کر میں تھک سا گیا ہوں۔ ویٹنگ روم کا فرش دھمک رہا ہے۔ لوگ چلتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب اس کوشش میں لگے ہیں کہ ان کے پیر نہ پھسل جائیں۔ ایک چھوٹی سی بچی چہرے پر خوفناک ماسک لگائے اپنی ماں کے پیچھے تقریباً دوڑ رہی ہے۔ ایک شخص سگریٹ سلگا رہا ہے اور اس پریشانی میں ہے کہ جلائی ہوئی ماچس کی تیلی کہاں پھینکے؟ ایک جہاز لینڈ کرتا ہے۔ دوسرا جہاز ٹیک آف کرتا ہے۔ میرے سامنے لگی ہوئی اسکرین پر دکھائی دینے والے اعداد وشمار تیزی سے بدل رہے ہیں اور پھر نقرہ تہران پر آ کر رک جاتے

ہیں۔ میں اپنے دل میں کہتا ہوں؛ کیا کوئی خدا ہے؟

ایئر پورٹ کے ہال میں وہی نسوانی آواز ایک بار پھر گونجتی ہے: اگلے چند لمحوں تک انقرہ سے ایران ہوائی جہاز مہر آباد انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے۔

اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے آنے والے لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ میں آرکڈز ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں کہ کہیں کوئی انھیں مسل نہ دے۔ مسافروں کے درمیان مہر داد کو پہچان لیتا ہوں۔ اس نے بھورے رنگ کا ایک کوٹ اور نیلے رنگ کی جینز پہن رکھی ہے۔ سن گلاسز لگا رکھے ہیں اور چہرے مہرے سے بالکل امریکی لگ رہا ہے۔ ابھی تک بالکل اسی طرح دبلا پتلا اور ڈھانچہ نما ہے۔ البتہ اس کا قد تھوڑا لمبا ہوگیا ہے اور مونچھیں بھی آگئی ہیں۔ جیسے ہی بھیڑ سے باہر آتا ہے، میں اس کی طرف لپکتا ہوں:

''السلام علیکم مہر داد!''

اسے اپنی عینک کے شیشوں کی دوسری طرف سے ماضی میں جھانکنے اور اپنے ساتھ کلاس کے ٹوٹے پھوٹے ڈیسک پر بیٹھے ہوئے لڑکے یعنی مجھے پہچاننے میں چند لمحے لگ ہی جاتے ہیں۔ پھر اچانک وہ میری آغوش میں آ گرتا ہے۔ جب میرے کان میں اس کے رونے کی ہلکی آواز آتی ہے تو میں آرکڈز اس کی کمر پر دبا کر کہتا ہوں: ''بھلے مانس کیا کر رہے ہو!''

ابھی میں مہر داد سے بدستور بغلگیر ہوں، جب اس کے کندھوں کے اوپر سے مجھے ہال کے انتہائی حصے میں ایک عورت نظر آتی ہے جو اپنے پاگل بیٹے کا ہاتھ تھامے ہال کے اندر موجود اخبار فروش کے اسٹال کی طرف جاتی ہے۔ اس کے بچے کا سر عجیب اور غیر فطری طور پر بڑا ہے۔

مہر داد کہتا ہے: ''کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔''

میں سوچتا ہوں: شاید کوئی خدا موجود نہیں ہے!

ایئر پورٹ سے برگ رستوراں کا درمیانی فاصلہ میں موسلا دھار بارش میں گاڑی چلاتے ہوئے طے کرتا ہوں۔ مہر داد کو گھر پہنچانے سے پہلے میں کچھ دیر اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں اس نے امریکہ کے شہر فلوریڈا میں ایسا کیا گند مچایا ہے کہ اب ایک چھوٹے بچے کی طرح

ناراض ہو کر اپنے خیالات میں کھویا ہوا ہے؟!

ہم ریستوراں کے ایک خالی کونے میں دو کرسیوں والی ایک میز ڈھونڈ کر وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ جب تک میں کھانے کا آرڈر دوں، مہرداد ہاتھ منہ دھو کر واپس آتا ہے اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ جنوری کے وسطی دن ہیں اور موسم سرما کی شروعات۔ ریستوراں خالی ہے۔ ہم سے چند میز کی دوری پر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مہرداد اپنی عینک اتارتا ہے اور یوں میں نو سال بعد اس کا پورا چہرہ دوبارہ دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔

میں کہتا ہوں: ''پتہ ہے، اس وقت میرا جی چاہ رہا ہے کہ تم مجھے فلوریڈا کی سب سے اچھی جگہوں کے بارے میں بتاؤ لیکن اس سے بھی پہلے جولیا کے بارے میں۔''

وہ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتا ہے: ''سردی بہت ہے!''

بیرا کھانا لگاتا ہے۔ میں اس لڑکے اور لڑکی کو گھورنے لگتا ہوں جو ہم سے چند میزوں کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دسرے کی آنکھوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ وہاں کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟! مہرداد اپنی پلیٹ میں چپس کے چند ٹکڑے رکھتا ہے۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔

میں کہتا ہوں: ''دیکھو میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ مجھے اور پریشان مت کرو پلیز۔ تم نے بتایا نہیں کہ جولیا کا کیا بنا؟''

مہرداد تلے ہوئے آلوؤں کے ٹکڑوں پر چٹنی ڈالتا ہے اور ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر وہی تلخ مسکراہٹ نمودار ہو جاتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس بار اس کی زبان بھی کھل جاتی ہے: ''میرا خیال تھا کہ پاگل لوگ صرف یہیں ملتے ہیں لیکن جولیا نے ثابت کر دکھایا کہ فلوریڈا میں بھی جتنے چاہو پاگل مل جائیں گے۔'' پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اپنی بات جاری رکھتا ہے: ''وہ خود بھی ان میں سے ایک تھی۔''

''مطلب وہاں بھی تمھارے اور میرے جیسے لوگ ملتے ہیں؟''

''جولیا مجھ سے اور تم سے کہیں زیادہ پاگل تھی۔''

میں ہنستے ہوئے کہتا ہوں: ''علی رضا سے بھی زیادہ پاگل تھی کیا؟''

مہرداد گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ شاید اس طرح اسے یاد آئے کہ یہ علی رضا کون ہے۔ پھر ایک چپس منہ میں رکھ کر پوچھتا ہے: ''اچھا یہ بتاؤ علی رضا کی کیا خیر خبر ہے؟''

''تمھارے امریکہ جانے کے چند مہینوں بعد وہ پھر محاذ پر چلا گیا۔ بہت جاتا تھا۔ امن قرارداد کی منظوری کے بعد محاذ سے واپس لوٹا اور امیر کبیر یونیورسٹی آف ٹکنالوجی سے کمپیوٹر انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد الیکٹریکل انجینئرنگ میں ماسٹرز کیا۔''

وہ دوبارہ سوال کرتا ہے: ''اور تمھاری پڑھائی؟''

میں جواب دیتا ہوں: ''ایک اچھے بچے کی طرح میں نے پہلے تو فلسفہ پڑھا۔ پھر سوشیالوجی میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی اور اب خدا بری نظر سے بچائے' اپنا پی ایچ ڈی تھیسز سماجی تحقیق پر لکھ رہا ہوں۔'' میں گلاس میں تھوڑا سا لیمو کا شربت ڈالتا ہوں اور پھر اس نوجوان جوڑے پر نگاہ ڈالتا ہوں جو اس بار ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ پھر کہتا ہوں: ''اور تم نے اپنی پڑھائی کے ساتھ کیا کیا؟''

وہ کھڑکی سے رستوراں کے باہر ایک نظر ڈالتا ہے۔ بارش کے قطرے صرف اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنا کانٹا پلیٹ کے ایک کونے پر رکھ کر کہتا ہے: ''میں دو سال تک جولیا کا دیوانہ بنا رہا۔ پھر فزکس پڑھی۔ علمِ نجوم کی طرف مائل ہوا۔ اور اب پچھلے ایک سال سے علمِ نجوم میں ماسٹرز کر رہا ہوں۔ پہلے دو سال میں گھنٹوں بیٹھ کر جولیا کو گھورتا رہتا تھا۔ وہ صرف مسکراتی رہتی تھی۔ پھر ہم نے شادی کر لی۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ میز پر رکھی چھری کی طرف دیکھ کر کہتا ہے: ''وہ ہمیشہ خود میں کھوئی رہتی ہے۔ کہتی ہے کہ اس کے پاس بہت سی دلیلیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے سرے سے موجود ہی نہیں ہونا چاہیے اور اسی وجہ سے ہمیشہ یہ دیکھ کر کہ وہ موجود ہے' حیرت زدہ رہتی ہے۔ وہ اپنے موجود ہونے سے متعلق کسی حتمی دلیل کی تلاش میں ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی شرٹ کی بڑی سی جیب سے اپنا بٹوہ نکال کر مجھے جولیا کی تصویر دکھاتا ہے۔

اس نے لمبے سے بھورے رنگ کی اسکرٹ کے اوپر بند گلے والی ایک سفید رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے اور ایک بڑی سی سپر مارکیٹ کے پاس کھڑی ہے۔ اپنے بال سر کے پیچھے جمع کرکے ان کا جوڑا بنا رکھا ہے۔"

- بہت خوبصورت لڑکی ہے۔

مہرداد اپنی عینک کا شیشہ ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ کبھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتی۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتی ہے کہ آج سے پچیس سال پہلے یعنی اپنی پیدائش سے پہلے وہ کہاں تھی؟ وہ جاننا چاہتی ہے کہ آج سے ٹھیک پچیس سال پہلے ہی کیوں پیدا ہوئی، ایک سال پہلے یا بعد میں کیوں نہیں؟ مجھ سے پوچھتی ہے کہ ہزاروں سے سال یہ کائنات موجود تھی لیکن وہ نہیں تھی، تو پھر کیا سبب تھا کہ آج سے پچیس سال پہلے اچانک وہ پیدا ہوا اور اسے اس طرح زندگی کے دامن میں پھینک دیا جائے؟ اور زندگی بھی کیسی؟ رنج وغم، فقر، بیماری اور اندوہ سے بھری ہوئی جس کی انتہا موت ہے۔ جولیا تخلیق، زندگی اور موت پر گہری تنقید کرتی ہے اور اس طرح اپنے لیے اس زندگی کو تلخ اور دشوار بنالیتی ہے۔"

مجھے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوتی ہے۔

مہرداد لیدر جیکٹ کا کالر اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر کہتا ہے: "تم نے شادی نہیں کی؟"

میں اس بیرے کی طرف دیکھتا ہوں جو اب اس جوڑے کے لیے میٹھا لے جا رہا ہے۔

پھر کہتا ہوں: "ابھی نہیں۔ ابھی میں اس منحوس تھیسز میں پھنسا ہوا ہوں۔"

یوں لگتا ہے جیسے نوجوان لڑکا اس نوجوان لڑکی کو کوئی سنسنی خیز کہانی سنا رہا ہے۔ اپنے ہاتھ ہوا میں لہراتا ہے اور منہ بناتا ہے۔ لڑکی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے۔

مہرداد رومال سے اپنے ہونٹ صاف کرتا ہے اور پھر کہتا ہے: "موضوع کیا ہے؟"

"مجھے ڈاکٹر محسن پارسا کی خودکشی پر ایک مکمل معاشرتی تجزیہ تحریر کرنا ہے جو آج سے دو سال پہلے ایک چھبیس منزلہ عمارت کی آٹھویں منزل سے نیچے کودا تھا۔ سماجی تحقیقات کے ادارے نے پہلے ہی یہ تھیسز مجھ سے خرید لیا ہے۔ مجھے اگلے تین مہینوں میں تھیسز جمع کرنا ہے۔ اس کے بعد کیا

پتہ شاید ایک ایرانی جولیا میں بھی ڈھونڈ لوں۔ ارے ہاں! تم جولیا کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟ جن الفاظ میں تم نے اس کی تعریف کی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار اسے قریب سے دیکھوں۔''

مہرداد کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو ستون کی طرح اپنے سر کے قریب لے جا کر ہتھیلیوں سے اپنی کنپٹیاں دباتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں: ''تم ٹھیک تو ہو؟''

اپنا سر اٹھائے بغیر کہتا ہے: ''میری بیٹی چار سال کی ہے۔ دو سال پہلے اس کی ماں کو سرطان کی بیماری لاحق ہوئی اور اس کا موڈ پھر خراب ہو گیا۔ جولیا کہتی ہے کہ بہترین مفروضہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ خدا سرے سے موجود ہی نہیں ہے کیونکہ صرف اسی صورت میں ہم تمام لاعلاج بیماریوں کا قصور اس کی گردن پر نہیں ڈال سکتے۔ جولیا کہتی ہے کہ یہ ناانصافی ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسی رکاوٹوں سے دوچار ہوں، جنھیں راستے سے ہٹانا اس کے بس میں نہیں۔''

اس نے بدستور اپنا سر اپنے ہاتھوں سے ٹیک لگائے رکھا ہے۔

میں پوچھتا ہوں: ''اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟''

اس کی نظریں میز کے بیچ رکھی ہوئی خالی پلیٹ پر جم گئی ہیں۔ کہتا ہے: ''مرنے والا انسان ایسا کیا کھو دیتا ہے جو زندہ انسانوں نے ابھی تک نہیں کھویا؟ ایک مرے ہوئے انسان میں اور ایک زندہ انسان میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

میرا جی بالکل بھی نہیں چاہتا کہ میں اس بارے میں اندازے لگاؤں۔

وہ اپنی بات جاری رکھتا ہے: ''جولیا شدید ترین ممکنہ حالت تک یعنی اس آخری حد تک جس میں ایک آدمی موت کے نزدیک جا کر بھی زندہ رہتا ہے، مرنے والی ہے۔''

یہ سن کر مجھے جیسے سانپ سونگھ جاتا ہے اور منہ میں رکھا ہوا میرا لقمہ حلق سے نیچے اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ یہ سوچ کر کہ میں نے نہایت حماقت سے کام لیتے ہوئے گفتگو کا رخ اس طرف موڑا ہے، مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ میں ٹپٹا کر کہتا ہوں: ''مجھے افسوس ہے۔ واقعی افسوس ہے!''

مہرداد ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

میں کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد کہتا ہوں: ''زندگی کے معنی تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ یہی تو ہے زندگی۔ میں تمھاری ڈھارس نہیں باندھ رہا لیکن کبھی کبھار زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں، جنھیں روکنا ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ سمجھ رہے ہو نا؟ ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر یہی ہمارے بس میں نہ ہونا اصلی اور سچی وضاحت ہے۔''

مہرداد اپنا ماتھا میز کے کنارے رکھ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں کچھ فاصلے پر رکھی میز کرسیوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ لڑکا لڑکی جا چکے ہیں اور بیرا کپڑے سے ان کی خالی میز کو پونچھا لگا رہا ہے۔

۲

میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچتا ہوں تو آدھی رات گزر چکی ہے۔ میں نے مہرداد کو اسی پریشانی کی حالت میں اس کی امی کے گھر ڈراپ کیا ہے۔ میں ابھی تک جولیا اور اس کی باتوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ مہرداد کے بارے میں بھی۔ مہرداد کی چار سالہ بیٹی کے بارے میں بھی، جس کا نام پوچھنا بھی مجھے یاد نہیں رہا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسا میرا جسم سلگنے لگا ہو۔ کھڑکیاں کھول کر پلنگ پر لیٹ جاتا ہوں۔ پھر ڈاکٹر محسن پارسا کے بارے میں اتنی دیر تک سوچتا ہوں کہ مجھے نیند آجاتی ہے۔ پتہ نہیں رات کا کون سا پہر ہے جب میں پاگلوں کی طرح سٹپٹا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ حرارت میری آنکھوں، ہاتھوں اور ماتھے سے باہر رینگ رہی ہے اور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ میرا سر پھٹنے کو آتا ہے اور اچانک مردنی سی چھا جاتی ہے۔ میں پسینے پسینے ہو جاتا ہوں۔ مجھے پیاس لگتی ہے اور پھر دوبارہ وہی درد شروع ہو جاتا ہے، جیسے ایک لمحے کے لیے میرا سر ورم کرتا ہے اور اگلے ہی لمحے اس کا ورم بیٹھ جاتا ہے۔ گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ گلاس دور سے دور تر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بار تو متلی بھی آنے لگتی ہے۔ میں پیٹھ کے بل پلنگ پر گر جاتا ہوں اور پلنگ میں لگی اسپرنگ مجھے اوپر نیچے اچھالتی ہے یہاں تک کہ رک جاتی ہے۔

کیسی منحوس رات ہے! صبح کیوں نہیں ہوتی!!

ایک بھیگا ہوا رومال اپنے ماتھے پر نچوڑتا ہوں۔ قطرے ٹپکنے سے پہلے ہی بھاپ بن جاتے ہیں اور بخار ماتھے سے دور بھاگنے لگتا ہے۔ اپنے پاؤں پانی کے ٹپ میں ڈالے پلنگ کے کنارے بیٹھ جاتا ہوں۔ جیسے ٹھنڈی ہوا جیسی کوئی شے تلوؤں سے ابروؤں تک دوڑنے لگتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے دوبارہ سلگنے لگتا ہوں۔ گرم بخار اور ٹھنڈا بخار۔ کہیں میں مرنے والا تو نہیں ہوں؟ میں نے ابھی تک خود کو پھانسی پر نہیں چڑھایا۔ موت سے پہلے مجھے کس چیز کو اپنی مٹھیوں میں بھینچنا چاہیے۔ مرنے سے پہلے مجھے اپنی انگلیاں مٹی میں دبانی چاہیے تاکہ جب مجھے زمین پر گھسیٹا جا رہا ہو تو چند لکیریں میری یادگار کے طور پر زمین پر کھنچی ہوئی ملیں! مجھے جانے سے پہلے اپنا آپ یہیں چھوڑنا ہوگا۔ میں اگر آج اپنی کوئی نشانی باقی نہیں چھوڑوں گا تو آنے والے وقتوں میں ماضی میں میرے موجود ہونے کا پتہ کیسے چلے گا؟ دوسرے اگر میرے پیروں کے نشان نہ دیکھ پائیں تو مطلب میں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ لیکن میں ناموجود نہیں رہنا چاہتا۔ میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ میں یہاں آیا اور بغیر کچھ کیے یہاں سے چلا گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ تاریخ میں میرا کوئی کردار نہ ہو، ان بے شمار لوگوں کی طرح جو آتے ہیں اور بغیر کچھ کیے چلے جاتے ہیں۔ میں انسانی تاریخ کا ایک نیوٹرل حصہ نہیں بننا چاہتا۔ آہ، میری امی کہاں ہے؟ مونس کہاں ہے؟ بھاڑ میں جائیں تحقیقات! محسن پارسا کتنا خوش نصیب ہے۔ اے بیچارے یونیورسٹی کے طالب علم! تم اگر ایک شخص کی موت کا مطلب نہ سمجھ سکو تو خود کیوں زندہ ہو؟ میری ڈگری، کام، شہرت، عشق اور مستقبل سب کے سب ایک مرے ہوئے شخص سے جڑے ہوئے ہیں۔ آج تک اتنی ساری خوشیاں ایک نقطے پر جمع نہیں ہوئی ہوں گی۔ وہ بھی ایک مرے ہوئے انسان، وہ بھی ایک سال میں، یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر محسن پارسا اور ہمارے دور کا معروف فزکس داں اچانک کیوں بیس سے زیادہ منزلوں والی عمارت کی آٹھویں منزل پر جا کر خود کو ایک عاشق اور جذباتی نوجوان کی طرح سڑک کے رخ پر کھڑکی سے آسفالٹ پر دھڑام سے پھینکے گا، مگر یہ کہ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو؟

اے بیچارے یونیورسٹی کے طالب علم! سیکڑوں کتابیں پڑھنے کے بعد بھی اگر تم اس سوال کا سائنسی اور سوشیالوجی پر مبنی جواب نہ ڈھونڈ سکو تو تمھیں اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری نہیں ملے گی اور تم ایک ایسے خواہ مخواہ پڑھے لکھے شخص میں بدل جاؤ گے جس کی نہ نہ صرف کوئی کتاب نہیں چھپے گی، بلکہ جو مشہور بھی نہیں ہو پائے گا اور جو شخص مشہور نہ ہو، وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ یعنی موجود تو ہے لیکن صرف اپنے لیے، دوسروں کے لیے نہیں اور جو شخص صرف اپنے لیے موجود ہو، اکیلا ہے اور مجھے اکیلے پن سے ڈر لگتا ہے۔

۳

کچھ دن ہوئے میں نے اخبارات میں ایک اشتہار چلا دیا ہے کہ جو کوئی ڈاکٹر محسن پارسا اور اس کی خودکشی کی وجہ کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرے یا اسے لگتا ہے کہ اس کی معلومات مفید ہو سکتی ہیں، میرے گھر یا سماجی تحقیقات کے ادارے میں واقع میرے دفتر میں مجھ سے رابطہ کرے۔ اپنا تھیسز مکمل کرنے کے لیے میرے پاس تین مہینے سے بھی کم وقت ہے۔ کام کچھوے کی رفتار سے ہو رہے ہیں۔ اب تک ملنے والی تمام تر معلومات چند سطروں سے زیادہ نہیں؛ محمد پارسا۔ 34 سالہ۔ کنوارا۔ پرنسٹن یونیورسٹی سے کوانٹم فزکس میں اسپیشلائزڈ پی ایچ ڈی، اندرونِ ملک یونیورسٹیوں میں چار سال تک پڑھانے کا تجربہ۔ سبجیکٹس: ماڈرن فزکس کے بنیادی اصول، عمومی نسبیت اور کوانٹم تھیوری۔ جدید فزکس کے بارے میں چار کتابیں۔ اپنے ساتھیوں کی نظر میں منظم، اصول پسند اور کسی حد تک سخت گیر، ریاضی اور فزکس کے مسائل کی تحلیل میں زبردست صلاحیتوں کا مالک، تاہم امتحانات کے سخت سوالوں سے لے کر نمبر دینے میں اس کی کنجوسی جیسے تمام معاملات میں اس کے اکثر شاگرد اس سے ناخوش تھے۔ شاید پارسا کی موت کی خبر سن کر اس کے بعض شاگرد من ہی من خوش بھی ہوئے ہوں گے۔ یہی وہ ساری باتیں تھیں جو مجھے ڈاکٹر محسن پارسا کے بارے میں اب تک معلوم ہوئی تھیں۔

میں اپنے بیگ سے ایک سینڈوچ نکالتا ہوں اور اپنی تحقیق سے متعلق یادداشتیں میز پر بکھیرتا ہوں۔ پارسا کے ہفتہ وار پروگرام ان میں سے الگ کرتا ہوں اور سینڈوچ پر اپنے دانت گاڑتا ہوں۔ میز پر رکھے اپنے کیلینڈر کو آٹھ اکتوبر جس دن پارسا نے خودکشی کی' پر لے جاتا ہوں۔ آٹھ اکتوبر بدھ کا دن تھا اور شیڈول کے مطابق اس نے اس دن دو بجے دوپہر کو کوانٹم پڑھایا ہوگا۔ مجھے اس بدھ کو کوانٹم کی کلاس میں موجود تمام شاگردوں سے بات کرنے کا خیال آتا ہے۔ شاید پارسا نے اپنی اس آخری کلاس میں، یعنی اپنی خودکشی سے ٹھیک پانچ گھنٹے پہلے، اس اقدام کی وجہ سے متعلق کوئی بات کی ہو یا اس کی طرف ہلکا سا اشارہ ہی کیا ہو۔ شاید مجھے کوئی ہی ہنٹ مل جائے۔ شاید۔۔۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔

''سماجی تحقیقات کا ادارہ۔ فرمائیے۔''

''آپ ابھی تک وہیں ہیں؟''

''سایہ! یہ تم ہو؟''

''سہ پہر کے تین بج رہے ہیں۔ میں نے فون کیا تھا، آپ اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں تھے۔ وہاں کیا کر رہے ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ آپ ابھی تک اس ڈاکٹر کے بارے میں سوچ رہے ہیں! کیا نام بتایا تھا آپ نے اس کا؟''

''پارسا۔ محمد محسن پارسا۔ فی الحال تو بر گر کھا رہا ہوں۔ تم ٹھیک ہو؟''

''میں ملنا چاہتی ہوں۔''

''آج شام کو۔ ہفت بہشت پارک کیسا رہے گا؟''

''اچھا ہے۔ وہیں پہلے والی جگہ۔ مگر ایک شرط ہے کہ آپ پارسا کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے۔''

''میں پانچ بجے تمہارا منتظر ہوں۔''

میں ٹیلیفون رکھ کر کرسی پر نیم دراز ہو جاتا ہوں۔ ڈاکٹر پارسا کی آخری کلاس میں موجود اُنیس شاگردوں کی فہرست کو غور سے دیکھتا ہوں۔ پھر اس فہرست کو ایک پیلے رنگ کی فائل میں رکھ

دیتا ہوں جس کے اوپر میں نے بھدی سی لکھائی میں "پارسا" لکھا ہے۔ پھر اپنے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا نگل لیتا ہوں۔ سایہ، اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں مسکراتی ہے، جسے میں نے اپنی میز کے شیشے کے نیچے رکھا ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ میں فوراً ریسیور اٹھاتا ہوں۔ ایک لڑکی ٹھہر ٹھہر کر انگریزی بول رہی ہے۔ گھبرائے ہوئے انداز میں۔ تیز تیز اور الفاظ دبے ہوئے ہیں۔ میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ رانگ نمبر ہے، لیکن وہ لڑکی بالکل ایک ریڈیو کی طرح مسلسل بولے چلی جا رہی ہے اور رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

"He knocked on the door but I didn't open it. He insisted............ and insisted but I still kept the door shut. Then he begged and I ignored him. He wanted to narrate me but I told him it is him who should be narrated and not me.

And he said he is completely confused. Like being in a spaghetti junction he had lost his way. He insisted on solving the problem. And of course he didn't and he couldn't. And it made me laugh."

پھر اسے رونا آتا ہے اور اس نے فون رکھ دیتی ہے۔ مجھے اس کے رونے پر تعجب ہوتا ہے اور میں بھی ریسیور رکھ دیتا ہوں۔ میری نگاہیں میز کے شیشے پر پھسلتی ہوئی بلیک اینڈ وائٹ تصویر پر جا کر جم جاتی ہیں۔ میں سینڈوچ کے گرد لپیٹا ہوا کاغذی کور، ڈسٹ بن میں پھینک دیتا ہوں۔

۴

میں ایک اخبار خریدتا ہوں اور ہفت بہشت پارک میں ایک سنسان جگہ پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں ۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے ۔ پارک میں لوگوں کی آمد و رفت بہت کم ہے ۔ میں اخبار کی ورق گردانی کرتا ہوں: کرنسی ریٹ میں کمی/ سیکڑوں سول اور پیداواری پراجیکٹس پر کام شروع/ چین سے ایکیوپنکچر کے ذریعے صرف چھ دنوں میں منشیات سے چھٹکارا/ تیزی و تکنیک میں سب سے آگے مرکز/ پرائیوٹ کلاسز/ پروگراموں کی فلم بندی/ پوسٹ ماڈرن ازم کی فلسفیانہ بنیادی اصول/ زیرِ زمین گٹر کی صفائی/ جہان ٹور کے ساتھ قبرص، ملائشیا، سنگاپور، یونان، ترکی اور انڈیا سفر کریں/ انا للہ و انا الیہ راجعون، پیارے دوست حاجیان صاحب! ہم مرحومہ مکرمہ کی جانکاہ وفات پر آپ کی اور آپ کے فرزندوں کی خدمت میں دل کی گہرائیوں سے تعزیت پیش کرتے ہیں اور خدا سے دعا گو ہیں کہ آپ کی عمریں۔۔۔

ایسے میں ایک بلی بہت تیزی سے میرے سامنے سے گزرتی ہے اور کچھ دور جا کر خوف کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہے ۔ منہ میں گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر اسے کھانے کے لیے ایک پرامن جگہ کی تلاش میں ہے ۔ درخت پر چڑھ کر ایک ٹہنی پر جھولتی ہوئی حالت میں اس کے کھانے سے فارغ ہونے تک بیٹھ جاتی ہے ۔ میں بہت دیر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں لیکن مجھے ایسی کوئی دوسری

بلی نظر نہیں آتی، جس سے اسے خطرہ لاحق ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ بلی اتنی پریشان کیوں ہے؟ میں سوچتا ہوں کہ ہم انسانوں کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے حیوانات کو تکلیف جھیلنے کی کیا ضرورت ہے؟ بلیاں کیوں ہیں؟ مخلوقات اتنی زیادہ کیوں ہیں؟ کتے، بلیاں، چوہے، چیونٹیاں، درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، ستارے، دن، انسان، انسان، انسان، انسان، انسان، انسان، انسان۔۔۔

''سلام یونس! کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں آپ؟''

''سلام۔ نہیں ابھی آیا ہوں۔ یونان جانا چاہو گی؟''

''یونان؟!''

''یہاں لکھا ہے، اخبار میں۔ ہم ہنی مون کے لیے یونان جائیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

سایہ میرے قریب بیٹھ جاتی ہے۔

''آپ کی بے فکری دیکھ کر مجھے نہیں لگتا کہ ہم اگلے دس سال تک یونان تو دور کی بات ہے، ابرقو بھی جا پائیں گے۔''

میں اخبار بینچ پر رکھ دیتا ہوں۔

''سب تمہارے ابو کا قصور ہے جو میری پی ایچ ڈی سے پہلے ہماری شادی نہیں ہونے دے رہے ہیں۔''

سایہ اپنے پرس سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر اس میں اپنے چہرے کے ایک خاص حصے کو گھورنے لگتی ہے۔

''دیکھیں یونس، مجھے ابو کے کاموں سے کوئی مطلب نہیں ہے لیکن ایک سال ہو گیا ہے آپ نے اپنا تھیسز مکمل نہیں کیا۔ پہلے تو آپ نے خود کئی بار تھیسز کا موضوع بدلا۔ پھر جب ایک موضوع منتخب کیا تو اس بار آپ استاد نے رد کر دیا۔''

میں اخبار بینچ پر رکھتا ہوں اور درخت کے اوپر بیٹھی ہوئی بلی کو دیکھتا ہوں جو اب اپنا لقمہ نگل چکی ہے اور زیر لب کہتا ہوں:

''ان میں میرے تھیسز کو سمجھنے کی سمجھ نہیں تھی۔''

سایہ دوبارہ پرس میں ہاتھ ڈال کر اس میں کچھ ڈھونڈتی ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں:

"تمہارے تھیسز کا کیا بنا؟ کیا موضوع بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"خدا اور حضرت موسیٰ (ع) کے مکالمے۔"

سایہ پرس سے موچنا نکال کر بڑی دقت سے اپنی بھوؤں کا ایک بال توڑتی ہے جو باقی بالوں کی سیدھ میں نہیں ہے۔ میں اپنے ہاتھ اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں ڈال کر کہتا ہوں:

"اپنے ابو سے کہو مزید تین مہینے صبر کرلیں۔ میں ان تین مہینوں میں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سچ کہوں تو میں خود بھی تھک گیا ہوں۔ شاید یہ میری بدقسمتی ہے کہ میری شادی ایک شخص کی وجہ سے رکی ہوئی ہے، لیکن آخرکار یہ معلوم ہوجانا چاہیے کہ اس بندے کو ایسی کیا موت آگئی تھی کہ اس نے اوپر جا کر نیچے چھلانگ لگا دی؟"

وہ اپنے پرس کی زپ بند کردیتی ہے۔ ہنستے ہوئے میرے ہاتھ میرے اوورکوٹ کی جیبوں سے باہر نکالتی ہے اور انھیں اپنے ہاتھوں میں لے کر کہتی ہے:

"ڈاکٹر صاحب! ہم نے طے کیا تھا کہ پارسا کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی!"

میں مسکرا دیتا ہوں اور اچانک میری نظریں حاجیان صاحب کی بیوی کی وفات کی خبر پر پڑتی ہے۔ اب بنچ پر سایہ کے پرس کے نیچے سے اس کا صرف ایک حصہ دکھائی دے رہا ہے۔

۵

اپارٹمنٹ میں میری واپسی کافی دیر سے ہوتی ہے۔ تھکا ماندہ۔ مجھے نویں منزل پر لے جانے والی لفٹ میں ہی مجھے اونگھ آنے لگتی ہے۔ میں ان چند دنوں میں اپنی پوری زندگی کے برابر چلا ہوں، بولا ہوں، نوٹس لیے ہیں، سوالات پوچھے ہیں، جوابات پانے میں ناکام رہا ہوں اور تھک گیا ہوں۔ فریج سے ایک سیب اٹھاتا ہوں اور فون ریکارڈر کا بٹن دباتا ہوں:

''السلام علیکم جناب۔ مجھے بس یہی کہنا تھا کہ واقعا کوئی بے کار آدمی ہی ہوگا جو علمی تحقیقات کی بجائے ان کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتا پھرے۔ مرے ہوئے لوگوں کی بجائے کم سے کم زندہ لوگوں پر ہی تحقیق کریں۔''

''السلام علیکم یونس، میں کئی بار فون کر چکی ہوں لیکن آپ کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ وقت ملے تو فون کریں۔ اپنے تھیسز کے بارے میں کچھ سوالات پوچھنے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ ان کے جوابات دے سکتے ہیں۔ آئی لو یو۔ سایہ!''

''السلام علیکم یونس۔ مہرداد بول رہا ہوں۔ کوئی خاص کام نہیں ہے۔ اداس تھا۔ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ بس یہی۔ وقت ملے تو فون کرنا۔''

میں ایک بار پھر سیب پر اپنے دانت گاڑتا ہوں اور صوفے پر لیٹ جاتا ہوں۔ اپنے جوتے اتارنے کی بھی سکت نہیں ہے۔ ڈاکٹر پارسا کی آخری کلاس میں حاضر انیس میں سے سترہ شاگردوں کو ڈھونڈنے اور بولنے، پوچھنے، سننے اور کچھ نہ سمجھنے نے مجھے بری طرح تھکا دیا ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر سڑک کی طرف کی کھڑکی کھول دیتا ہوں۔ مجھے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ شاگردوں میں سے کچھ نے کہا ہے کہ انھیں کچھ یاد نہیں ہے، جبکہ کچھ نے کہا کہ پارسا اس دن کچھ اداس لگ رہا تھا۔ لیکن اس بارے میں سارے شاگرد متفق الرائے تھے کہ پچھلے سمسٹروں کی نسبت اس سمسٹر میں پارسا ذرا نرم دل ہو گیا تھا۔ میں نیچے جھک کر دیکھتا ہوں۔ گاڑیاں ایسے چوہوں کی مانند اِدھر اُدھر دوڑ رہی ہیں جن کے سروں کو آگ لگ گئی ہو۔ اب صرف دو شاگرد بچے ہیں جن سے ملنا باقی ہے۔ ایک کا نام شہرہ بنیادی ہے جو اصفہان یونیورسٹی چلی گئی ہے اور دوسری طالبہ مہتاب کرانہ ہے، جس نے اس سمسٹر میں چھٹی لے رکھی ہے۔

میں سب کا کچرہ ایوین اوپر سے نیچے پھینکتا ہوں اور کچھ دیر تک ہوا میں اسے آزادی سے گرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ میں کھڑکی بند کرتا ہوں۔ چوہوں کے ہارن بجانے کی آوازیں بند ہو جاتی ہیں۔ ریسیور اٹھاتا ہوں۔ سایہ ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ جب وادی مقدس میں خدا ایک درخت کے ذریعے موسیٰ پر ظاہر ہوا اور اسے اپنے جوتے اتارنے کا حکم دیا تو جوتے اتارنے سے خدا کی مراد کیا تھی؟ وہ پوچھتی ہے کہ کیا جوتے اتارنے کے کوئی علامتی معنی ہیں یا نہیں؟ میں کھڑکی کے فریم سے سامنے والی اونچی عمارت کو دیکھتا ہوں۔ اس کی ایک کھڑکی کا بلب بجھ جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں:

''کیا فرق پڑتا ہے؟ میرے خیال میں جو بات اہم ہے، وہ یہ ہے کہ خدا نے موسیٰ (ع) سے کلام کیا اور موسیٰ (ع) وہ واحد انسان ہیں جنھوں نے خدا کی آواز سنی۔ بس یہی۔''

وہ کہتی ہے:

''چونکہ جوتے سفر کی علامت اور جانے کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے کیا انھیں اتارنے کا

مطلب منزل تک رسائی اور وصال ہونا نہیں ہے؟"

میں فون کی تار اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ جواب دیتا ہوں:

"شاید۔"

تاہم یوں لگتا ہے جیسے سایہ کو "شاید" سے بڑھ کر کچھ سننا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اسے مطمئن کروں کہ اس نے جو کہا ہے بالکل درست ہے۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ کم سے کم ان دنوں تو بالکل بھی نہیں۔ جب فی الحال میرے پاس خدا کے وجود کو ثابت کرنے یا اس کے وجود کا انکار کرنے کے کوئی اسباب نہیں، اور شک ہمیشہ ایک پینڈولم کی طرح مجھے ایمان اور کفر کے بیچ جھلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "خدا اور موسیٰ (ع) کے مکالمے" جیسے موضوع کے بارے میں کوئی بھی بات کرنا میرے لیے کتنا ناخوش آیند اور تھکا دینے والا ہوگا۔ سایہ دوبارہ اصرار کرتی ہے کہ شاید اس طرح اسے کوئی بہتر جواب مل جائے۔ اس موضوع سے فرار کے لیے میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے آتا ہے۔ میں کہتا ہوں:

"شاید علی رضا کو اس بارے میں کچھ معلوم ہو۔ کیا تم چاہو گی کہ کل میں اس سے اس بارے میں پوچھوں؟!"

وہ مان جاتی ہے۔ ہم شب بخیر کہہ کر ریسیور رکھ دیتے ہیں۔ جیسے مجھے امید ہے کہ فون کی گھنٹی دوبارہ بجے گی، میں چند منٹ تک اپنا ہاتھ ریسیور کے اوپر رکھتا ہوں لیکن دوبارہ فون نہیں آتا۔ ایک لمحے کے لیے سڑک کے اس پار سامنے والی عمارت کو دیکھتا ہوں، جس کی ساری کھڑکیاں اندھیرے میں ڈوب چکی ہیں۔

۶

اگلی صبح میں مہرداد کے فون سے جاگ جاتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مخل نہیں تو وہ آج کا دن میرے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ آدھے گھنٹے بعد اپنے گھر کے باہر میرا منتظر رہے۔ میں ریسیور رکھتا ہوں اور دوبارہ پلنگ پر پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہوں۔ ایک منٹ تک کمرے کی چھت کو گھورتا رہتا ہوں جہاں پلاسٹر کی ایک ہلکی دراڑ نے کمرے کے ایک کونے کو جیسے کاٹ دیا ہے۔ پھر اُٹھتا ہوں۔ نہاتا ہوں اور لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور اور سڑک والی منزل تک پہنچنے کے لیے نو منزلیں نیچے اترتا ہوں۔ چاروں طرف برف پھیلی ہے اور ہوا بالکل صاف ستھری ہے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں اپنی گھڑی دیکھتا ہوں۔ 7 فروری ہے۔

تھیسز کا جائزہ لینے والی سائنٹفک ٹیم کے سامنے اپنی تحقیقی رپورٹ پیش کرنے کے لیے اب میرے پاس ٹھیک تہتر (73) دن ہیں۔ نسترن تین نامی گلی میں مڑتے ہی مجھے مہرداد نظر آجاتا ہے جو فٹ پاتھ پر پڑی برف میں پنڈلیوں تک گھسا ہوا میرا منتظر ہے۔ اس نے وہی ایئرپورٹ والے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی سب سے پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے، مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے مصر ہے کہ میں اپنے کام دیکھ لوں اور وہ صرف میرے ساتھ رہے۔

میں ہنستے ہوئے کہتا ہوں: ''جو ساتھ رہتا ہے، کسی حد تک پریشان بھی کرتا ہے، نہیں؟''

وہ نہیں ہنستا، جیسے اس نے مدتوں اس بارے میں سوچا ہو، کہتا ہے: ''پہلے پہل نہیں، لیکن رفتہ رفتہ پریشان کرنے لگتا ہے اور حتیٰ کہ ممانعت بھی ایجاد کرتا ہے۔'' اور پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے: ''اور یہی عشق کی خصوصیت ہے۔'' لیکن میں اس میں چھپے کنایے کو نہیں سمجھ پاتا۔

ہم دونوں سیدھے سماجی تحقیقات کے ادارے میں میرے دفتر پہنچ جاتے ہیں جو ایک اُنیس منزلہ عمارت کی ساتویں منزل پر واقع ایک کمرہ ہے۔ جب تک میں کھڑکیوں کے پردے ہٹاؤں، مہرداد کمرے کے در و دیوار کا جائزہ لیتا ہے۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی ڈورکھیم کا اسکیچ دیکھتا ہے اور پھر ایک نظم کے ٹکڑے پر مشتمل اس فریم کو گھورتا ہے جسے میں نے بچوں کی طرح نستعلیق لکھائی میں خوش خط لکھا ہے:

میں انتہائی رات کی بات کر رہی ہوں
میں انتہائی اندھیرے اور انتہائی رات کی بات کر رہی ہوں
اے میرے مہرباں!
تم میرے گھر آؤ
تو میرے لیے چراغ لیتے آنا
اور ایک کھڑکی بھی
جس سے میں
خوش قسمت گلی کی بھیڑ میں جھانک سکوں!

مہرداد آ کر میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی نظر سایہ کی تصویر پر پڑتی ہے جو میں نے اپنی میز پر موٹے شیشے کے نیچے رکھی ہے۔

''بڑی معصوم لڑکی لگتی ہے۔ شادی کب کر رہے ہو؟''

میں اس کے اس مکرر اور پریشان کن سوال کا جواب بھی مکرر انداز میں دیتا ہوں:

''جیسے ہی اس پراجیکٹ سے جان چھوٹتی ہے۔شاید تین ماہ بعد۔شاید چار مہینے بعد۔شاید اس سے بھی زیادہ۔سایہ کا باپ کہتا ہے کہ میں اپنی ڈگری لینے سے پہلے شادی کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔''

وہ اپنی عینک اتار کر پوچھتا ہے:

''یونیورسٹی کی طالبہ ہے؟''

میں بال پوائنٹ کی تلاش میں میز پر بکھرے کاغذات اِدھر اُدھر کرتے ہوئے کہتا ہوں:

''الٰہیات میں ایم اے کر رہی ہے۔وہ بھی تھیسز لکھ رہی ہے۔''

''آخر کار تم نے ایک مذہبی لڑکی ہی کو چنا۔مجھے اندازہ تھا کہ ان نو برسوں میں تم بالکل بھی نہیں بدلے ہو گے۔''

بال پوائنٹ مجھے میز پر رکھے کیلنڈر میں مل جاتا ہے اور میں ہنستے ہوئے کہتا ہوں:

''تمہارا اندازہ بالکل غلط ہے۔سایہ مذہبی لڑکی ضرور ہے لیکن اگر علمِ نجوم کے حوالے سے بات کی جائے تو اب میرے اور نو سال پہلے والے یونس کے درمیان نو نوری برسوں کا فاصلہ ہے۔''

وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا جاتا ہے:

''اچھا اس کے تھیسز کا موضوع کیا ہے؟''

''خدا اور حضرت موسیٰ (ع) کے مکالمے۔یقین جانو یہ میرا مشورہ نہیں تھا۔''

اپنے لیدر جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگاتا ہے۔اس کا چہرہ ابھی تک کھڑکی کی طرف ہے۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، آج سے نو سال پہلے تم نے فلسفے کا سبجیکٹ لیا تھا تاکہ تم 'دین' کا دفاع فلسفیانہ نقطہ نظر سے کر سکو۔''

وہ سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے اچانک ایک ایسی بات کہہ جاتا ہے جسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بالکل یہی جملہ چند ہفتوں پہلے علی رضا نے بھی ٹیلیفون پر مجھ سے کہا تھا: ''چابیاں جس آسانی سے دروازے کھولتی ہیں، اسی آسانی سے

انھیں بند بھی کر دیتی ہیں۔گویا فلسفے نے بری طرح دروازہ بند کر رکھا ہے۔"

میں فیضی تفتیشی کا ایڈریس کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر اس سے پوچھتا ہوں: "تمھارے خیال میں وہ سرے سے موجود ہے بھی یا نہیں؟"

اس کی نظریں نیچے سڑک سے زیادہ سامنے ٹکی ہوئی ہیں، سامنے والی عمارت پر لگے ہوئے اشتہارات کے چند سائن بورڈز پر۔

"دروازے کی بات کر رہے ہو یا چابی کی؟"

"میں خدا کی بات کر رہا ہوں۔"

اسے زور کا دھچکا لگتا ہے۔وہ مڑ کر میری آنکھوں میں گھورنے لگتا ہے۔

میں کرسی سے اٹھ کر کہتا ہوں: "تمھارے خیال میں کیا خدا ہے؟ فی الحال یہ سب سے اہم چیز ہے جو میں جاننا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ اس منحوس تھیسز، پارسا کی خودکشی کی دلیل اور دیگر بہت سی چیزوں سے بھی اہم۔میرے خیال میں اس سوال کے جواب سے بہت سارے مسائل خودبخود حل ہو جائیں گے جبکہ اس کا جواب نہ ملنے کی صورت میں بہت ساری چیزیں ابدآباد تک گھپ اندھیرے میں رہ جائیں گی۔سو خدا ہے یا نہیں؟" میری آواز تھوڑی سی اونچی ہو گئی ہے لیکن میں پرواہ نہیں کرتا۔مہرداد ٹھیک میرے سامنے کھڑا ہے۔

ہلکا سا کھانستا ہے اور کہتا ہے: "میں نہیں جانتا۔"

جیسے میں نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو، خواہ مخواہ غصے سے پھٹ پڑتا ہوں: "کئی میلین انسان ہیں جنھیں اس سوال سے ذرہ بھر تکلیف نہیں ہوتی اور وہ اپنی ساٹھ ستر سالہ عمر کے لیے ایک ہزار سالہ کاموں کی پلاننگ کرتے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا حتمی اور تشفی بخش جواب ڈھونڈے بغیر کوئی کام کرے، چلے پھرے، شادی کرے، کھانا کھائے، شاپنگ کرے، بات کرے اور یہاں تک کہ سانس لے؟! طویل پلاننگ تو دور کی بات ہے۔اگر خدا نہیں ہے تو ہم کیوں ہیں؟ اس سیارے پر زندگی کے آثار پیدا ہونے کے امکانات تقریباً زیرو تھے اور یہ بات تم مجھ سے بہتر جانتے ہو زیرو! سمجھ رہے ہو؟ لیکن یہی زیرو فیصد اچانک سو فیصد

میں بدل جاتا ہے، اس لیے ہم ہیں۔ ہمارے موجود ہونے یا دوسرے لفظوں میں اس تقریباً زیرو فیصد کے سو فیصد ہو جانے کا مطلب یہ ہے ایک مضبوط اور ذی شعور ارادہ اس بات پر مائل تھا کہ ہم وجود میں آئیں۔ یہی وہ چیز ہے جو جولیا کو ہمہ وقت پریشان رکھتی تھی اور جو ہر رات صبح تک ایک دیمک کی طرح میری روح چاٹتی رہتی ہے۔ دوسری طرف، اگر خدا ہے تو یہ ساری مصیبتیں کیوں ہیں؟ کائنات میں چاروں طرف پائی جانے والی یہ بدبختی اور شر و آفات کس لیے ہیں؟ کہاں ہے وہ قادرِ مطلق؟ چیزیں اتنی بے ترتیب اور تکلیف دہ کیوں ہیں؟ کہاں ہے وہ مہربان ہاتھ جسے لوگ لاکھ پکاریں، کسی کی مدد کو نہیں آتا؟ اس کرہ خاکی پر ہر دن کئی ملین لوگوں کے حقوق پائمال ہوتے ہیں اور یہ تمام لوگ خدا کو مدد کے لیے بھی پکارتے ہیں لیکن کوئی معجزہ رونما نہیں ہوتا۔ ایک بھی معجزہ! ظالم روز بروز طاقتور ہو رہے ہیں اور کمزوروں کو دنیا میں جگہ جگہ یا تو سیلاب بہا کر لے جاتا ہے یا زلزلہ آتا ہے اور زمین انھیں نگل لیتی ہے۔ اگر وہ ان آفات سے زندہ بچ بھی جائیں تو مفلسی، بھوک اور بیماری ان کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔ اتنے سارے اپاہج بچے کس بات کا تاوان بھر رہے ہیں؟ انھوں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ انھیں اپنی پیدائش سے لے آخر عمر تک (البتہ اگر زندہ رہیں) پیدائشی اندھے پن، پیدائشی فالج، جسم کے کسی حصے کے نہ ہونے یا اس طرح کے بے شمار مسائل کا سامنا رہتا ہے؟ اور تم نے بھوک سے مرنے والوں کے بارے میں رپورٹ تو یقیناً پڑھی ہو گی؟''

میری انگلیاں واضح طور پر کانپ رہی ہیں۔ مہرداد تقریباً چیخ اٹھتا ہے: ''میں نہیں جانتا! وہ واحد چیز جو میں اس بارے میں جانتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تمھیں بھی معلوم ہونا چاہیے (یعنی جاننے کی کوشش کرنی چاہیے) یہ ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ اس ڈراؤنے سوال کا سب سے باادب اور نہایت محتاط انداز بیان ہے جس کی توقع انسان سے رکھی جا سکتی ہے۔ کیا خلا کی انتہا ہے؟ کیا کئی بلین کہکشاؤں پر بھی زندگی پائی جاتی ہے؟ ایسی کہکشائیں جن میں سے ہر کہکشاں کئی بلین ایسے سورجوں سے مل کر بنی ہے جن میں سے ہر ایک ہمارے سورج سے بڑا ہے! کیا کاربن کے علاوہ کسی شئے پر مبنی زندگی کا وجود ہے؟ کیا دس کلومیٹر سے زیادہ گہرائی رکھنے والے سمندروں کی تاریک تہوں میں بھی جاندار موجود ہو سکتے ہیں؟ یہ اور اس طرح کے سیکڑوں اور سوالات ہیں جو سب کے سب

تمھارے خوف ناک سوال سے کہیں آسان ہیں، ان تمام سوالات کا صرف ایک ہی جواب ہے: ہم نہیں جانتے۔ یہ وہ چیز ہے جو سائنس ہم سے کہتی ہے۔ سائنس اب تک کی سب سے قابل بھروسہ اور سب سے سچا ذریعہ ہے جو نہایت احترام سے ہم سے کہتی ہے: میں کچھ نہیں جانتی!''

اس کے ہاتھ کی سگریٹ پوری طرح راکھ میں بدل چکی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا من ہلکا ہو گیا ہو۔ میں ایک گہری سانس لیتا ہوں اور تفتیشی کا ایڈریس اٹھا کر اپنی شرٹ کی جیب میں رکھ دیتا ہوں۔ مہرداد اپنی باقی ماندہ سگریٹ ایش ٹرے میں دباتا ہے اور ہم دونوں میرے دفتر سے نکل کر کوریڈور میں لفٹ کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: ''یہ کہ سمندروں کی تہہ میں کوئی جاندار ہے یا نہیں، یا خلا متناہی ہے یا لامتناہی، یا زمین کے علاوہ کسی دوسرے سیارے پر زندگی کا وجود ہے یا نہیں، ان تمام باتوں سے میری زندگی پر کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ تاہم میرے لیے خدا کا وجود و عدم بہت معنی رکھتا ہے۔ اگر خدا موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے ساتھ چیزیں ختم نہیں ہوں گی۔ اور ایسے میں اگر میں اپنی ساری زندگی اس کے موجود نہ ہونے کے خیال کے ساتھ گزاروں تو سمجھو میں نے بڑا خطرہ مول لیا ہے اور میں اس خطرے کو اپنے پورے وجود کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔''

لفٹ کھلتے ہی ہم اندر داخل ہوتے ہیں۔ ایک بڑھیا سودا سلف سے بھری ٹوکری کے ساتھ اپنے پاس کھڑی ایک نوجوان لڑکی سے بس کی ٹکٹیں مہنگی ہونے کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ پورا راستہ وہ بس میں کھڑی تھی۔ اسے اس بات کا کافی دکھ ہے کہ ٹکٹیں تو روز مہنگی ہو رہی ہیں لیکن اس کی لائن کی بسوں میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ لفٹ ہمیں سترہویں منزل پر لے جاتی ہے جہاں بڑھیا اور نوجوان لڑکی کو جانا ہے۔ نیچے آتے وقت مہرداد لفٹ کے آئینے کے سامنے اپنے بال بناتے ہوئے پوچھتا ہے: ''اور اگر خدا موجود نہ ہوا تو؟''

''اگر خدا موجود نہ ہو تو موت کے ساتھ ہی تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ ایسی صورت میں خدا کی موجودگی فرضیے کے ساتھ زندگی گزارنا اور نتیجتاً بہت سی لذتوں سے دوری اختیار کرنا، یہ جانتے ہوئے کہ ہمیں صرف ایک بار زندگی گزارنی ہے، بہت بڑا نقصان ہوگا۔''

تمھارے خوف ناک سوال سے کہیں آسان ہیں، ان تمام سوالات کا صرف ایک ہی جواب ہے: ہم نہیں جانتے۔ یہ وہ چیز ہے جو سائنس ہم سے کہتی ہے۔ سائنس اب تک کی سب سے قابل بھروسہ اور سب سے سچا ذریعہ ہے جو نہایت احترام سے ہم سے کہتی ہے: میں کچھ نہیں جانتی!''

اس کے ہاتھ کی سگریٹ پوری طرح راکھ میں بدل چکی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا من ہلکا ہوگیا ہو۔ میں ایک گہری سانس لیتا ہوں اور تفتیشی کا ایڈریس اٹھا کر اپنی شرٹ کی جیب میں رکھ دیتا ہوں۔ مہرداد اپنی باقی ماندہ سگریٹ ایش ٹرے میں دباتا ہے اور ہم دونوں میرے دفتر سے نکل کر کوریڈور میں لفٹ کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: ''یہ کہ سمندروں کی تہہ میں کوئی جاندار ہے یا نہیں، یا خلا متناہی ہے یا لامتناہی، یا زمین کے علاوہ کسی دوسرے سیارے پر زندگی کا وجود ہے یا نہیں، ان تمام باتوں سے میری زندگی پر کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ تاہم میرے لیے خدا کا وجود و عدم بہت معنی رکھتا ہے۔ اگر خدا موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے ساتھ چیزیں ختم نہیں ہوں گی۔ اور ایسے میں اگر میں اپنی ساری زندگی اس کے موجود نہ ہونے کے خیال کے ساتھ گزاروں تو سمجھو میں نے بڑا خطرہ مول لیا ہے اور میں اس خطرے کو اپنے پورے وجود کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔''

لفٹ کھلتے ہی ہم اندر داخل ہوتے ہیں۔ ایک بڑھیا سودا سلف سے بھری ٹوکری کے ساتھ اپنے پاس کھڑی ایک نوجوان لڑکی سے بس کی ٹکٹیں مہنگی ہونے کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ پورا راستہ وہ بس میں کھڑی تھی۔ اسے اس بات کا کافی دکھ ہے کہ ٹکٹیں تو روز مہنگی ہو رہی ہیں لیکن اس کی لائن کی بسوں میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ لفٹ ہمیں سترہویں منزل پر لے جاتی ہے جہاں بڑھیا اور نوجوان لڑکی کو جانا ہے۔ نیچے آتے وقت مہرداد لفٹ کے آئینے کے سامنے اپنے بال بناتے ہوئے پوچھتا ہے: ''اور اگر خدا موجود نہ ہوا تو؟''

''اگر خدا موجود نہ ہو تو موت کے ساتھ ہی تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ ایسی صورت میں خدا کی موجودگی فرضیے کے ساتھ زندگی گزارنا اور نتیجتاً بہت سی لذتوں سے دوری اختیار کرنا، یہ جانتے ہوئے کہ ہمیں صرف ایک بار زندگی گزارنی ہے، بہت بڑا نقصان ہوگا۔''

گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر لفٹ کھلتی ہے اور ہم پارکنگ کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہیں تو مہرداد ایک اور سگریٹ سلگاتی ہے اور کہتا ہے: ''بہرحال یہ ایسا سوال ہے جس کا حتمی جواب (بشرطیکہ جواب ہاں میں ہو) ہم موت کے بعد ہی جان سکتے ہیں لیکن اگر اس کا جواب نہیں میں ہو یعنی خدا سرے سے موجود ہی نہ ہو تو ہم اس کا جواب کبھی نہیں جان پائیں گے۔'' وہ سگریٹ کا دھواں کھڑکی سے باہر پھونکتا ہے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ''اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بڑا خوف ناک سوال ہے۔'' پھر دبی ہوئی آواز میں کہتا ہے: ''جولیا اس طرح کے بے شمار سوالوں کو 'وحشت ناک سوالات' کا نام دیتی ہے۔''

میں ایک ٹرک کے پیچھے پیچھے ہائی وے سے نکل کر سڑک کے کنارے پیٹرول پمپ کی طرف ڈرائیو کرنے لگتا ہوں۔ کچھ دیر بعد ہم ٹریفک کی وجہ سے اسی ٹرک کے پیچھے رک جاتے ہیں۔ مہرداد گاڑی کی ریڈیو کا بٹن دباتا ہے تو اناؤنسر اپنی آخری سائنسی خبر سنا رہا ہوتا ہے:

''اسٹین فورڈ یونیورسٹی امریکہ میں کمپیوٹر سائنس کے دو ماہرین انٹرنیٹ پر ایک ایسا سرچ انجن بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں جو بغیر ویب سائٹ ایڈریس کے چند منٹوں میں ہی کوئی بھی اخبار، میگزین، نیوز ایجنسی یا کتاب ڈھونڈنے اور مطالعے کے لیے اسے آپ کے اسکرین پر لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ان دو نوجوان ماہرین نے اس پروگرام کے لیے (جسے Yahoo کا نام دیا گیا ہے) چار مہینے محنت کی ہے اور بدلے میں فی کس ڈیڑھ سو ملین ڈالر لیے ہیں۔''

خبریں ختم ہوتے ہی مہرداد کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ پہلے تو مجھے لگتا ہے کہ اس کی مسکراہٹ کی وجہ ڈیڑھ سو ملین ڈالر کی بڑی رقم ہے، تاہم اس کی نگاہیں کہیں اور گھور رہی ہیں جس سے مجھے شک ہوتا ہے۔ مہرداد ٹرک کے پیچھے لکھی ہوئی عبارت کو گھور رہا ہے۔ البتہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوڈر کے زنگ لگے ہوئے حصے پر بری لکھائی میں لکھی ہوئی ''ہائے بے وفا! تمھارے ساتھ جہنم، تمھارے بغیر جنت سے زیادہ حسین ہے!'' کی عبارت کو گھور رہا ہے یا ٹرک کے پچھلے ٹائروں کے کور پر لکھے ہوئے دو ''ہا ہو'' کو جو گارے کے باوجود ابھی تک صاف پڑھے جا سکتے ہیں۔

۷

عدالت کی لفٹ خراب ہے اور ہم چھٹی منزل تک کھچا کھچ بھری سیڑھیاں چڑھ کر جانے پر مجبور ہیں۔ سیڑھیوں کے ہر موڑ پر پہنچ کر مہرداد کو اپنی سانس بحال کرنے کے لیے تھوڑی دیر تک رکنا پڑتا ہے۔ میں چوتھی منزل پر پہنچتا ہوں تو مہرداد مجھے تیسری منزل کی سیڑھیوں پر موڑ مڑتے ہوئے لمبی لمبی سانس لیتے اور چوتھی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے ہجوم کے درمیان نظر آتا ہے۔

ہجوم سیڑھیوں کے علاوہ، عدالت کے کوریڈورز اور صحن میں بھی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ ایک اُدھیڑ عمر عورت اپنے دو بچوں کا ہاتھ تھامے اپنے شوہر کو لعنت ملامت کر رہی ہے۔ ایک سپاہی ایک نوجوان کے ہم راہ سیڑھیاں اتر رہا ہے، جسے اس نے ہتھکڑیاں پہنا رکھی تھیں۔ ایک بڑھیا بہت دیر رکنے کے بعد سیڑھیاں چڑھنے لگتی ہے جو زیرلب دعائیں پڑھ رہی ہے۔ کوریڈور کی دونوں جانب لگے دروازے مسلسل کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ مجھے جو بھی دکھائی دیتا ہے، اپنی بغل میں ایک فائل دبائے دکھائی دیتا ہے۔ بڑھیا اپنے پاس سے گزرنے والی عورت سے کسی کمرے یا شخص کا پتا پوچھتی ہے لیکن وہ عورت اسے دیکھے بغیر جلدی سے ایک کمرے میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس عورت نے بڑھیا کی طرف دیکھا کیوں نہیں؟ چند افراد قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے ایک کمرے کے باہر انتظار میں کھڑے ہیں۔ وہ کس چیز کا انتظار

کر رہے ہیں؟ ایک شخص نے تیزی سے کوریڈور میں دوڑ رہا ہے اور دوڑتے ہوئے ایک اور بندے سے جا ٹکراتا ہے تاہم دونوں میں سے کسی نے اس بات کی پرواہ نہیں۔ وہ شخص اتنی عجلت میں کیوں ہے؟ اتنے سارے لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں؟ پاگلوں کی طرح سیڑھیاں چڑھتی اور اترتی ہوئی دو ٹانگوں والی ان مخلوقات میں سے ہر ایک ذہن میں اس وقت کیا چل رہا ہے؟

مجھے اپنے سر کے پیچھے سے ایک خوف ناک آواز سنائی دیتی ہے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور دو سپاہی جنھوں نے ایک شخص کو بازوؤں سے پکڑ رکھا ہے، اسے کمرے سے باہر لاتے ہیں۔ وہ شخص ان کے ہاتھوں سے بھاگنا چاہتا ہے لیکن سپاہی اسے زمین پر گھسیٹنے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس شخص عجیب و غریب انداز میں چلانا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے۔ اس ہجوم میں میری نظریں مہرداد کو ڈھونڈنے لگتی ہیں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتا۔ میں ایک بار پھر فیضی تفتیشی کے پتے پر نظر ڈالتا ہوں جو میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے پھانسی کی سزا پانے والے شخص نے ابھی سے پھانسی کا پھندا اپنے گلے کے گرد محسوس کر لیا ہے۔ اس لیے زور زور سے چلانے لگا ہے۔ میں ڈر کے مارے اس سے دور ہو جاتا ہوں۔ مجھے کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے؟

مہرداد کچھ دور کھڑا سگریٹ سلگا رہا ہے۔ فیضی تفتیشی کا دفتر چھٹی منزل پر کوریڈور کے انتہائی سرے پر واقع ہے۔ مہرداد کوریڈور کے بینچ پر بیٹھ جاتا ہے تاکہ میں اندر جا کر تفتیشی سے بات کر سکوں۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں تین سے زائد بار فون پر تفتیشی فیضی سے بات کر چکا ہوں، اس کے باوجود مجھے سارا ماجرا چند منٹوں میں دوبارہ بیان کرنا پڑتا ہے، تب جا کے اسے میرے بارے میں سب کچھ یاد آ جاتا ہے۔ اسے پارسا کے کیس میں بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ اس کیس میں کوئی خاص مدعی نہیں تھا، اس لیے اسے بند کر دیا گیا ہے۔

اسے کیس کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے میرے بار بار اصرار کرنے پر ثقافتی امور کی خدمت کرنے اور علم و دانش اور تحقیقات اور ان جیسی دوسری بکواسیات میں مدد کرنے کے لیے پارسا کی فائل صرف ایک گھنٹے کے لیے میری تحویل میں دینے کی حامی بھری ہے،

وہ بھی آرشیو کے دفتر میں بیٹھ کر اور دفتر کے انچارج محسن خان کی موجودگی میں۔ میں آرشیو کے انچارج کے نام فیضی تفتیشی کا لیٹر لیتا ہوں اور اس کے کمرے سے باہر نکلتا ہوں۔ میں ابھی اس سوچ میں ہوں کہ محسن خان آرشیو کے دفتر کے انچارج کا نام ہے یا اس کا خاندانی نام؟ باہر نکل کر مہرداد مجھے کوریڈور کے بینچ پر بیٹھا دکھائی نہیں دیتا۔ میں مہرداد کی تلاش میں ایک ایک کر کے کوریڈور کے سارے کمرے دیکھ لیتا ہوں، لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتا۔ میں چند منٹ تک وہاں موجود ہجوم کو غور سے دیکھتا ہوں تاکہ شاید تیزی سے گزرتے ہوئے ان لوگوں کی بھیڑ میں مجھے مہرداد نظر آجائے۔ میں لیٹرینوں سے لے کر ٹیرس اور یہاں تک کہ نماز خانوں تک جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہاں تو ہرگز نہیں گیا ہوگا' چھان مارتا ہوں۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کی فکر ہونے لگتی ہے۔ لفٹ ابھی تک خراب ہے۔ میں سیڑھیاں اترتے ہوئے سیڑھیوں اور ان کی موڑ پر جہاں لوگ تیزی سے رفت وآمد میں مصروف ہیں' اسے ڈھونڈتا ہوں لیکن وہ نہیں ملتا۔

عدالت کے صحن میں پہنچ کر میں ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں تاکہ میری سانسیں بحال ہوسکیں۔ صحن کے ایک کونے میں لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جمع ہے۔ میں ہجوم کی طرف بڑھتا ہوں۔ پھانسی کی سزا پانے والا وہی شخص جسے میں نے چھٹی منزل پر دیکھا تھا، لوگوں اور سپاہیوں کے حلقے میں گھرا ہوا ہے اور اب کی بار چیخنے چلانے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر منتیں کر رہا ہے۔ اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ وہ بالکل ایک بیوہ عورت کی طرح رو رہا ہے جس کا شوہر ابھی ابھی مرا ہو۔ مہرداد بھی مجھے اس ہجوم میں دکھائی دیتا ہے جو پھانسی کی سزا پانے والے شخص کو غور سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی عینک کے شیشے بھی صاف کر رہا ہے۔

چند منٹ بعد، ہم عدالت کی عمارت کی زیر زمین پہنچ چکے ہیں۔ آرشیو کے دفتر کا انچارج تیس پینتیس سالہ ایک جوان اور بذلہ گو شخص ہے جس کے سر کے زیادہ تر بال جھڑ چکے ہیں اور چلتے وقت تھوڑا سا لنگڑاتا ہے۔ وہ چند بار فائلوں سے بھرے ہوئے شیلفوں کی طرف جاتا اور واپس آتا ہے، یہاں تک کہ آخر کار اسے وہ پھٹی پرانی فائل اس نہایت خستہ لیجر بائنڈر میں مل جاتی ہے جس میں اس کی گنجائش سے دوگنا فائلیں رکھی گئی ہیں۔ وہ پارسا کی فائل مجھے تھماتے ہوئے کہتا ہے: ''یہ رہا پارسا

صاحب کا نامہ اعمال۔ مجھے امید ہے وہ جنتی ہوں گے۔"

میں مزاقاً کہتا ہوں: "میں غسال ہوں اور لوگوں کے جنتی یا دوزخی ہونے سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔"

وہ لکڑی کی ایک چھوٹی سی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے:

"ہم سب غسال ہیں بھائی جان لیکن غسالوں کو بھی ایک دن مرنا ہے۔"

میں اور مہرداد لکڑی کی میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ میں جلدی جلدی فائل کی ورق گردانی شروع کرتا ہوں۔ مہرداد ایک اور سگریٹ سلگاتا ہے اور پھانسی کی سزا پانے والے شخص کے بارے میں محسن خان سے سوال پوچھتا ہے۔ میں نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتا اور مجھے ایک گھنٹے تک اپنی تحویل میں لی ہوئی اس فائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا ہے۔ میں ابھی نوٹس بنانے میں مصروف ہوں جب آرشیو کے دفتر کا انچارج اچانک مہرداد کو ایک ایسی بات کہتا ہے جس نے ایک لمحے کے لیے مجھے رک کر اسے حیرت سے دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پتہ نہیں مہرداد نے کیا پوچھا تھا جس کے جواب میں محسن خان کہتا ہے: "غسال، مردوں سے نہیں ڈرتے لیکن انھیں موت سے ضرور ڈر لگتا ہے۔"

مہرداد اس سے پوچھتا ہے: "اور تم؟ کیا تم موت سے ڈرتے ہو؟"

وہ مسکراتے ہوئے کہتا ہے: "شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن مجھے موت سے نہیں بلکہ موت کو مجھ سے ڈر لگتا ہے۔"

البتہ نہ مجھے اس کی بات پر یقین آتا ہے اور نہ مہرداد کو۔

میں دوبارہ 343 صفحات پر مشتمل فائل کی ورق گردانی شروع کرتا ہوں۔ پارسا کی ایک تصویر پیلے کلر کی فائل کے ساتھ اسٹیپلر کے ذریعے چسپاں ہے۔ تفتیشی کی جامع رپورٹ پہلے کے چند صفحات پر لکھی گئی ہے:

"ڈاکٹر محسن پارسا، ایران کی یونیورسٹیوں میں فزکس کے پروفیسر، بدھ کے دن تقریباً ۷ بج کر ۱۵ منٹ پر ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء نگین آبی نامہ چھبیس منزلہ تجارتی کمپلیکس کی آٹھویں منزل پر گیا اور

کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ یہ کمرہ ایک ایسی فیکٹری کا سیلز آفس ہے جو ایک قسم کی گھریلو کیڑے مار دوائیاں بناتی ہے۔علاقے کے عینی شاہدین اور ڈاکٹروں کے معائنے کے مطابق پارسا موقع واردات پر ہی جان کی بازی ہار گیا تھا۔موقع واردات پر فیکٹری کے دفتر کی سیکریٹری فرانک گوہر اصل بنت منصور کوئی اور موجود نہیں تھا۔"

چند صفحے بعد، وہ بیان آتا ہے جو تفتیشی نے فرانک گوہر اصل سے لیا ہے اور جسے ٹیپ ریکارڈر سے سیدھا کاغذ پر اتارا گیا تھا:

"شام کے ساڑھے سات بجے تھے جب پارسا صاحب ہمارے آفس آئے اور کہا کہ انھیں بہت سی کیڑے مار دوائیاں چاہئیں، بہت زیادہ۔میں نے انھیں آرڈر پیپر دیے۔یقین جانیے انھیں دیکھ کر بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پاگل ہوں گے۔وہ نہایت ہی پرسکون تھے۔جب بھی مجھے وہ لمحہ یاد آتا ہے میرا رواں رواں کانپنے لگتا ہے۔پارسا نے کہا: 'حشرات الارض کو بھی جینے کا حق ہے۔ہم کیوں انھیں مارتے ہیں؟' میں نے کہا' یعنی مذاق کرتے ہوئے کہا: 'آپ کو حشرات الارض سے اتنی ہی محبت ہے تو اتنی ساری کیڑے مار دوائیاں کیوں خرید رہے ہیں؟' وہ بولے: 'ہر چند کسی چیز کو چاہنا، اسے قتل نہ کرنے کے لیے ایک اچھی دلیل ثابت نہیں ہوسکتا لیکن میں حشرات الارض کو مارنا نہیں چاہتا ہوں۔' پھر مجھ سے کہا کہ اگر دفتر میں کیڑے مار دوائیوں سے متعلق کوئی کیٹلاگ یا بروشر موجود ہے تو وہ بھی انھیں دکھاؤں۔میں ساتھ والے کمرے میں چلی گئی کہ شیلف سے چند کیٹلاگ لے آؤں لیکن جب واپس آئی تو پارسا وہاں نہیں تھے۔" (یہاں پہنچ کر عینی گواہ رونے لگتی ہے اور جب اس کی حالت سنبھلتی ہے تو دوبارہ بولنے لگتی ہے:)

"میں واپس آئی تو پارسا وہاں نہیں تھے۔ان کا بیگ چائے کی میز پر پڑا ہوا تھا، اس لیے مجھے لگا کہ وہ باہر گئے ہیں اور تھوڑی دیر تک واپس آجائیں گے۔میں چند منٹ تک ان کا انتظار کرتی رہی، لیکن وہ واپس نہیں آئے۔تب اچانک میری نظر کھڑکی پر پڑی جس کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔میں کھڑکی بند کرنے گئی، جب مجھے نیچے سے شور شرابا سنائی دیا، میں نے جھانک کر دیکھا تو لوگوں کو سڑک پر پڑے ہوئے ایک جنازے کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے پایا۔" (یہاں پہنچ کر عینی شاہد

ایک بار پھر رونے لگتی ہے اور جب اس کا رونا بند ہو جاتا ہے تو دوبارہ اپنی بات جاری رکھتی ہے)

''گوہراصل صاحبہ، آپ پرسکون رہنے کی کوشش کریں۔ اس حادثے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے آپ کی باتیں ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ کیا اس دن پارسا صاحب نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں آپ سے کچھ کہا تھا یا نہیں؟''

''جی نہیں۔ کچھ نہیں کہا۔ پارسا نے صرف وہی کہا جو میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ پارسا نے صرف کیڑے مار دوائیوں کے بارے میں بتایا تھا اور بس۔''

مہر داد ابھی تک آرشیو کے اس بذلہ گو نوجوان کے ساتھ باتوں میں لگا ہوا ہے۔ میں چند منٹ تک اس کی باتیں سنتا ہوں تو مجھے جنگ، گولیاں، راکٹ، آوارگی، خوف، شہادت اور جنت جیسے پراگندہ الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد میں دوبارہ اپنی فائل میں کھو جاتا ہوں۔ فائل کے صفحہ نمبر 98 پر ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق مقتول نے دماغی نکسیر پھوٹنے سے موقع واردات پر ہی دم توڑ دیا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مزید جزئیات کی طرف اشارہ گیا ہے:

''مقتول کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی ہیں، ریڑھ کی ہڈی، بائیں شانے، گردن اور پسلیوں کو شدید نقصان پہنچا ہے۔''

موقع واردات پر لی ہوئی فنگر پرنٹس سے بھی مقتول کے قتل میں کسی بھی دوسرے شخص کی مداخلت کی پوری طرح نفی ہوئی ہے۔ بظاہر کیڑے مار دوائیوں کی فیکٹری کے سیلز آفس کی سیکریٹری کو رہا کرنے کی اصلی وجہ یہی رپورٹ تھی۔ خودکشی کی عمومی شرائط کے بارے میں عدالت کے ماہر نفسیات کا بیان بھی دلچسپ ہے:

''قتل یا خودکشی کی شرائط اس وقت فراہم آتی ہیں جب ایک شخص اس ابنارمل صورتحال اور دشواری سے باہر نکلنے کو اپنے لیے ناممکن سمجھتا ہے، جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ ایک بحرانی صورتحال ایک ایسے مسئلے کی شکل اختیار کر سکتی ہے جسے حل کرنے کی صلاحیت اس شخص میں نہیں پائی جاتی یا وہ شخص یوں گمان کرتا ہے کہ وہ اس مسئلے کا حل تلاش نہیں کر سکتا ہے۔ ایسے حالات میں اس کا ذہن اس بحرانی صورتحال سے نکلنے اور درحقیقت اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دو غیر فطری صورتوں کا انتخاب

کر سکتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ اس مسئلے کو سرے سے مٹانا چاہتا ہے اور اِس صورت میں اگر اُس کے سامنے کوئی انسانی رکاوٹ موجود ہو تو عام طور پر اس کا قتل کر دیتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ بعض دلائل کی بنا پر اس مسئلے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے مسئلے کو حل کرنے والے کو ہی محو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اس صورتحال کا نتیجہ عام طور پر خودکشی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔"

مہرداد اور محسن خان زور سے قہقہہ لگاتے ہیں اور میں بے ارادہ اپنا سر اٹھا کر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ بات کیا ہے؟ لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مہرداد جب سے امریکہ سے آیا ہے، میں نے پہلی بار اسے اس طرح قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں باقی فائل کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ فائل کے آخر میں فیضی تفتیشی کے بیانات ہیں۔ اس کے خیال میں شدید ذہنی مشغلے، کنوارے پن اور ایک انجانے غم نے پارسا کو خودکشی پر اکسایا ہے، لیکن یہ (انجانا غم) کیا ہے؟ سارا مسئلہ اسی سوال کی وجہ سے رکا ہوا ہے۔ پارسا کیوں مایوس ہوا ہے؟ فیضی نے پارسا کی مایوسی کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے یا اُس کے پاس اِس بارے میں کوئی وضاحت نہیں تھی۔ میں نے فائل بند کرتا ہوں اور پیکٹ کے اندر رکھی ہوئی تمام چیزیں (جو اس فائل کے ساتھ جڑی ہوئی تھی) میز کے اوپر بکھیر دیتا ہوں: پرس، چابیوں کا ایک گچھا، ایک بال پوائنٹ جس کا اوپری حصہ ٹوٹ گیا ہے اور پارسا کی عینک کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے، وہ تمام تر چیزیں ہیں جو موقع واردات پر اس کے ہمراہ پائی گئی ہیں۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی ہے جس پر ایک ایڈریس لکھا ہوا ہے اور جو خون کے دھبوں کی وجہ سے کئی جگہوں پر کالا پڑ گیا ہے۔ میں وہ ایڈریس نوٹ کرتا ہوں اور جب سر اٹھاتا ہوں تو ایک ایسی چیز دیکھتا ہوں جسے دیکھ کر میں حیران رہ جاتا ہوں۔ محسن خان نے اپنی مصنوعی ٹانگ گھٹنے کی جگہ سے الگ کر کے میز پر رکھ دی ہے۔ مہرداد اس کی باتوں میں کھویا ہوا ہے۔ محسن خان کہتا ہے کہ جب مارٹر کے ٹکڑے اس کے پاؤں پر لگے تو اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح اس کی ٹانگ الگ ہو کر مورچے میں گری۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں ایک پل کے لیے مہرداد کی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوں

جو پوری طرح بھیگی ہوئی ہیں۔ یہ سوچ کر کہ آج میں نے اسے اپنے ہمراہ آنے دیا تھا، میں من ہی من ہزاروں بار خود پہ لعنتیں بھیجتا ہوں۔

مہرداد کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے بہترین اقدام یہی ہے کہ وہ گھر کے ایک کونے میں پڑا رہے اور پھر چپ چاپ واپس امریکہ چلا جائے۔ ہم دوبارہ گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں اور میں تجسس کی وجہ سے دوبارہ پارسا کی خودکشی کے مقام کی طرف ڈرائیو کرنے لگتا ہوں۔ مہرداد اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہم ایک لفظ بھی نہیں کہتے ہیں۔ میں ریڈیو آن کرتا ہوں تاکہ اس طرح مہرداد کی توجہ ہٹا سکوں جو شاید ابھی تک مزاحیہ شخصیت کے مالک محسن خان کی طرف مبذول ہے۔ ریڈیو پر گھریلو خواتین کو ٹماٹر کیچپ بنانے کا درست طریقہ سکھایا جا رہا ہے۔ میں نگین آبی عمارت کے سامنے گاڑی کھڑی کرتا ہوں اور پھر دونوں سڑک کے دوسری جانب اس جگہ جاتے ہیں جہاں پارسا نے خود کو سڑک پر گرایا تھا۔ مہرداد سڑک کے کنارے کھڑے سگریٹ فروش سے چند عدد سگریٹ خریدتا اور ان میں سے ایک وہیں سلگانے لگتا ہے۔ سڑک کے شمالی حصے سے ایک ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی ہے اور میں اس کی شدت سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھ اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں ڈال دیتا ہوں۔ مہرداد تھوڑی دوری پر سگریٹ فروش کی جلائی ہوئی آگ کے پاس کھڑے ہو کر آگ سینکنے لگتا ہے۔ پرائمری اسکول سے ابھی ابھی چھٹی ہو کر آنے والے چند لڑکے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ایک بلی کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔ میں سڑک کے ڈامبر کو اس طرح غور سے دیکھ رہا ہوں گویا اس پر پارسا کی موت کی وجہ لکھی ہوئی ہو۔ وہ بلی بڑی تیزی سے میرے پاس سے گزرتی ہے اور اپنے پیچھے دوڑتے ہوئے بچوں کے خوف سے سڑک کے کنارے رکھے ہوئے بڑے سے کوڑے دان میں چھپ جاتی ہے۔ میں ابھی تک ویسے ہی ڈامبر کو غور سے دیکھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے زیرلب کہتا ہوں: ''کیا خدا ہے؟'' سڑک کے کنارے کھڑا سگریٹ فروش دور سے چلاتا ہے: ''جناب کچھ کھو گیا ہے آپ کا؟''

۸

میں مہر داد کو اس کے گھر پہنچا تا ہوں ۔اپارٹمنٹ میں پہنچتا ہوں تو مغرب کی اذان ہو رہی ہے ۔ دروازہ کھولتا ہوں تو دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان سے ایک کاغذ زمین پر گرتا ہے ۔جیرُفت سے خط آیا ہے ۔صوفے پر بیٹھتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے ۔سایہ ہے جو یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس کے سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے مجھے علی رضا سے بات کرنے کا وقت ملا یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ آج میں عدالت میں تھا لیکن ہفتے کے آخر تک علی سے ضرور پوچھوں گا۔ سایہ کوئی اعتراض نہیں کرتی ۔کوئی اور بات بھی نہیں کرتی اور ہم دونوں نے ریسیور رکھ دیتے ہیں ۔ان دو برسوں کے دوران، جب سے میں نے سایہ سے نکاح کیا ہے، اس نے کبھی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا ہے ۔اسے اپنی شادی کی جلدی بھی اس لیے ہے کیونکہ اس کے گھر والے اس پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں ۔سایہ کسی بات پر اعتراض کیوں نہیں کرتی ہے؟ یہاں تک کہ کسی چیز کے بارے میں اسے کوئی شک و شبہ بھی نہیں ہوتا ہے ۔سایہ کے لیے تمام باتیں پتھر پہ لکیر کی طرح ناقابل تغیر ہیں ۔اسے اس بات پر کہ میں اس کی زندگی کا سب سے بہترین شخص ہوں جو اسے بہت خوش رکھے گا اور اگلے چند برسوں تک ہمارے چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہوں گے، اتنا ہی یقین ہے جتنا یقین اس بات پر کہ حضرت موسیٰ نے اپنے پیرہن سے ایک چمکتی ہوئی شئے باہر نکالی تھی یا خدا نے کسی زمانے میں کوہِ طور

پر تجلی کی تھی۔ کاش سایہ کے یقین کا ایک ذرہ برابر حصہ میرے دل میں بھی ہوتا۔ یہاں تک کہ اس عمارت کا چوکیدار، محلے کا جمعدار، گلی کے نکڑ پر پھل بیچنے والا، سایہ کا ارب پتی باپ اور ہزاروں انسان ایسے یقین سے زندگی گزار رہے ہیں کہ مجھے ہمیشہ ان کے یقین پر رشک آتا ہے۔ ان کا یہ یقین کہاں سے آیا ہے؟؟ جہالت سے؟ اگر تخلیق کائنات کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچنے سے ایسا یقین حاصل ہوتا ہے تو میری طرف سے ہزار لعنت ہو ایسے جاننے اور سمجھنے پر۔

میں خط کھولتا ہوں:

''السلام علیکم یونس بھیا! امید ہے خیریت ہوگی۔ ہم سب بھی خیریت سے ہیں۔ بس امی کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ان کے سینے میں انفیکشن ہوگیا ہے اور مسلسل کھانستی رہتی ہیں۔ ان کے پیروں میں بھی درد تو پہلے سے تھا، اب پیر پتھر کی طرح سخت اور منجمد ہو گئے ہیں۔ امی چل پھر نہیں سکتیں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ میں یہ باتیں آپ کو نہ لکھوں تاکہ آپ کا دھیان پڑھائی کی طرف لگا رہے۔ تاہم میں یہ باتیں آپ سے نہیں کروں گی تو اور کس سے کروں گی؟ پچھلے ہفتے ڈاکٹر نے ان کے لیے کچھ دوائیں تجویز کی ہیں جن میں سے ایک بھی جیرفت میں نہیں مل رہی ہے۔ خط کے ساتھ آپ کو ڈاکٹر کا نسخہ بھی بھیج رہی ہوں۔ اگر دوائیں تہران سے دستیاب ہوسکیں تو انھیں جیرفت پوسٹ کر دیں۔ دوسری بات یہ کہ چند دن پہلے میرے لیے ایک رشتہ آیا تھا۔ بندہ لٹریچر پڑھاتا ہے۔ ہم نے کہا کہ آپ عید پر آئیں گے تو اس سے بات کرلیں تاکہ آپ کی رائے بھی معلوم ہوسکے۔

چشم براہ

آپ کی بہن مونس

۷ فروری ۱۹۹۶ء''

میں خط ٹیلیفون کے ساتھ رکھی چھوٹی سی میز پر رکھتا ہوں اور خود صوفے پر لیٹ جاتا ہوں۔ میری نظر ایک بار پھر کمرے کی چھت کی دراڑ پر پڑتی ہے۔ میں کروٹ بدل کر ریڈیو آن کرتا ہوں۔ مختصر سی موسیقی کے بعد بچوں کے لیے ''رات کا قصہ'' پروگرام شروع ہوتا ہے۔ میری پلکیں بوجھل ہونے لگی ہیں۔ مجھے امی اور مونس بہت یاد آرہی ہے۔ قصہ گو خاتون بچوں کو سلام کرتی ہے اور

میں سوچنے لگتا ہوں کہ اگر واقعی پارسا نے خواہ مخواہ اور اچانک پاگل پن کے دورے کی وجہ سے کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہو تو کیا ہوگا؟ کہانی ایک ننھی چڑیا اور ریشم کے کیڑے کی دوستی پر مشتمل ہے جو توت کے درخت پر ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ میں اپنے آپ سے کہتا ہوں: ''امی مر گئیں تو؟'' قصہ گو خاتون کہتی ہے: ''ریشم کا کیڑا بھی چڑیا کی طرح اڑنا چاہتا تھا لیکن اڑ نہیں پاتا تھا۔ ایک دن چڑیا نے اسے اپنی چونچ میں لیا اور اڑنے لگی۔ تاہم اس کی تیز چونچ سے کیڑے کا نرم و نازک جسم زخمی ہو گیا۔'' اگر میں اپنا تھیسز وقت پر مکمل نہ کر سکا تو؟ ''ریشم کے کیڑے نے چڑیا سے کہا کہ وہ چڑیا کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے بل پر اڑنا چاہتا ہے۔'' اگر میری کوئی کتاب شائع نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ اگر میں کبھی مشہور نہ ہوا تو؟ ''چند دن ہوئے چڑیا نے ریشم کے کیڑے کو کھو دیا تھا اور اس کی تلاش میں جنگل کا کونا کونا چھان مارا تھا لیکن ریشم کا کیڑا اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔'' مجھے کل صبح ضرور علی رضا کے پاس جا کر اس سے سایہ کے سوالوں کے جوابات معلوم کرنے چاہئیں۔ ''یہاں تک کہ ایک دن ایک خوبصورت تتلی اڑتی ہوئی آئی اور توت کے درخت کی ایک شاخ پر ننھی چڑیا کے قریب بیٹھ گئی۔ تتلی نے ننھی چڑیا کو سلام کیا اور کہا: پہچانا؟'' پارسا نے خودکشی کے لیے کیڑے مار دوائیاں فروخت کرنے والے دفتر کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ چڑیا بولی: ''نہیں۔ میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' مجھے ایک بار پارسا کے گھر بھی جانا چاہیے، شاید وہاں کوئی سراغ مل سکے۔ تتلی بولی: 'تم کیسے مجھے نہیں پہچان پائیں؟ میں وہی ریشم کا کیڑا ہوں۔ ایک عرصے تک اپنے گرد بنائے ہوئے کوکون میں زندگی گزاری، یہاں تک کہ تتلی بن گئی۔' کیا خدا ہے؟ کیا خدا نہیں ہے؟

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا: ''جی فرمائیے!''

''کیا آپ فردوس صاحب ہیں؟ یونس فردوس؟''

''جی بول رہا ہوں۔ فرمائیے۔''

''میں کیوان بایرام بات کر رہا ہوں۔ بچپن میں پارسا کا کلاس فیلو تھا۔''

پارسا کا نام سنتے ہی میں صوفے پر نیم خیز حالت میں بیٹھ جاتا ہوں۔ ریڈیو ابھی تک چل رہا ہے۔

''پارسا کے کلاس فیلو؟''

"جی جناب، لیکن جناب میں پڑھائی میں اس کی طرح تیز نہیں تھا، اس لیے زندگی میں کچھ زیادہ ترقی نہیں کرسکا۔ اخبار میں آپ کا اشتہار دیکھا۔ میں پارسا سے آخری بار اس کی خودکشی سے چند گھنٹے پہلے ہی ملا تھا۔ جب میں نے اخبار میں اس کی خودکشی کی خبر پڑھی تو اپنی بیگم سے کہا کہ میری اور پارسا کی ملاقات اس کی خودکشی سے ٹھیک چند گھنٹے پہلے ہی ہوئی تھی۔ اس دن ہم نے ایک دوسرے سے کچھ ایسی باتیں کیں جو شاید آپ کے کام آئیں۔"

جہاں وہ کام کرتا تھا، میں نے اس کا پتہ لیا اور اگلے دن اس سے ملنے کا وعدہ کیا۔ ریڈیو سے مسلسل روانڈا، افغانستان، بوسنیا اور جنوبی لبنان میں قتل و غارت کی خبریں آ رہی تھیں۔ میں کھڑکی کی طرف پیٹھ کیے ابھی تک صوفے پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میری نظریں میز پر رکھی گھڑی پر پڑتی ہیں جو رک گئی ہے اور غلط وقت بتا رہی ہے۔ ریڈیو پر بتایا گیا کہ کل موسم دو درجہ سینٹی گریڈ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

میں اگلی صبح نو بجے کیوان بایرام سے ملنے ذبح خانہ پہنچتا ہوں۔ بایرام وہاں ذبح کیے جانے والی گائے اور بھیڑوں کے گوشت کی جانچ کا انچارج ہے۔ مجھے اس کا پتہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دور سے دیکھ کر ہی اسے پہچان لیتا ہوں۔ اس نے چہرے پر ایک سفید ماسک لگا رکھا ہے اور ویٹرنری کی مہر ہاتھ میں لیے گایوں کی لاشوں پر لگا رہا ہے۔ ہر طرف خون اور تعفن کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ ذبح ہونے والے ہر جانور کی خرخراہٹ کی آواز کافی دیر تک کانوں سے ٹکراتی رہتی ہے۔ تقریباً چاروں طرف اندھیرا ہے۔ قصائیوں نے گھٹنوں تک پہنچنے والے بوٹ اور موٹے اور کالے رنگ کے کور پہن رکھے ہیں، جن کے سِروں سے مسلسل خون ٹپک رہا ہے۔ میں بایرام سے اپنا تعارف کراتا ہوں۔ وہ اپنی سگریٹ ہونٹوں سے ہٹاتا ہے۔ چونکہ وہ بات کرنے کے لیے ذبح خوانے سے باہر نہیں آسکتا، اس لیے معذرت طلب کرتا ہے۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال لگ رہی ہے۔ کندھے چوڑے اور بال سنہرے ہیں۔ ہم ذبح خانے سے خون کو باہر لے جانے والی نالی کے پاس کھڑے ہیں جو دالان کے عین وسط میں بنائی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پارسا کی خودکشی سے ٹھیک تین گھنٹے پہلے اس سے "کہانی شہر" نامی سینما میں "اگرانڈ یسمبلین" کی فلم سے پہلے دیکھی ہے۔

"ہم نے سلام دعا کی اور میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی بیوی کا تعارف کیا۔"

''پھر کیا ہوا؟ کیا آپ دونوں کے بیچ کوئی خاص بات ہوئی؟ پارسا نے کوئی قابل ذکر بات نہیں کہی؟''

شور مچاتے ہوئے کچھ لوگ ایک بیل کو ذبح خانے کے انتہائی سرے سے دالان کے اندر لا رہے ہیں۔ بیل نیم وحشی ہو رہی ہے اور لوگ بیل کے گلے میں مضبوط رسی ڈال کر اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یایرام اپنی سگریٹ اپنے ہونٹوں کے سرے تک لاتے ہوئے بے روح لاش پر ٹھپہ مارتا ہے۔

''نہیں۔ بس یہ کہ میں نے مذاق میں کہا: ''ڈاکٹر صاحب، آج سینما کی یاد کیسے آگئی؟ یونیورسٹی سے سینما بہت دور ہے۔''

اچانک بیل نے اپنے گرد ایک چکر کاٹتا اور آس پاس کھڑے لوگوں میں سے ایک پر حملہ کرتا ہے۔

''اس نے خون کی بو سونگھ لی ہے۔ خون کی خوشبو انھیں پاگل کر دیتی ہے۔''

''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

''اس نے کہا، یعنی مذاق میں کہا: 'مجھے معلوم نہیں تھا کہ سینما یہ مہم بھی سر کرسکتا ہے!' میں نے پوچھا: 'کیسی مہم؟' پارسا نے کہا: 'پیچیدہ مساوات (Complex Equations) حل کرنا' یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات کہی تھی اس نے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ اس کے اصلی لفظ کیا تھے لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ میری بیوی اس کی بات سن کر بڑی حیران ہوئی تھی۔ بس یہی۔ پتہ نہیں میں آپ کی کوئی مدد کر پایا ہوں یا۔۔۔''

میں مزید کچھ نہیں سن پاتا اور ذبح خانے کے انتہائی سرے کو گھورنے لگتا ہوں جہاں کچھ چیزیں ہلتی دکھائی دے رہی ہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کچھ لوگ ایک بڑی سی کالی شئے پر جھکے ہوئے اسے ہلنے نہیں دے رہے ہیں۔ اندھیرے سے کسی ایسی عورت کے چیخنے کی آواز آرہی ہے جسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جا رہا ہو۔ اچانک وہ چیخ ایک غیر مختتم خرخراہٹ میں بدل جاتی ہے اور پھر ہمارے پیروں کے نیچے کی نالی گرم خون سے بھر جاتی ہے۔

۹

شام کے چار بجے ہیں۔ میں پچھلے دو تین گھنٹوں سے مسلسل ناصر خسرو کی گلیوں میں پھر رہا ہوں تاکہ امی کے لیے تجویز کردہ دوائیں خرید سکوں۔ یہ علاقہ ایسے اسمگلروں سے بھرا ہوا ہے جنھوں نے اپنے تنگ و تاریک گوداموں میں ہر قسم کی نایاب دوائیں چھپا رکھی ہیں۔ کوئی کہتا ہے: ''رسول اللہ ﷺ کی قسم! میرے پاس نہیں ہیں۔ مطلب واقعی نہیں ہیں اور تم بھی ڈھونڈنے کی زحمت مت کرو۔'' کوئی کہتا ہے: ''اگر کسی کے پاس مل بھی گئیں تو بہت مہنگے داموں بیچے گا۔'' کوئی بولا: ''شاید یاقوت میڈیسن والے سے مل جائے۔'' لیکن یاقوت میڈیسن والا بھی کہتا ہے: ''نہیں ہیں۔ مطلب تھیں لیکن آپ کے آنے سے پہلے ہی ایک بڑھیا کو بیچ دیں جو بہت ٹسوے بہا رہی تھی۔ آپ جمشید تیار کے پاس جائیں، شاید وہاں سے مل جائیں۔'' بدقسمتی سے اس بار جمشید تیار بھی تیار نہیں ہے لیکن وہ ڈاکٹر یعقوب شراب کا پتہ دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ اسے مت بتانا کہ تمھیں میں نے بھیجا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ڈاکٹر یعقوب پوچھے تو کہوں کہ داوود خان نے بھیجا ہے۔ یعقوب ٹائر بیچنے والی کی ایک دکان کے زیرِ زمین گودام میں کچھ لوگوں سے بات کرتا ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں۔ میں اپنا تعارف کراتا ہوں اور نسخہ آگے بڑھا دیتا ہوں۔ اس بندے کی نظریں ابھی نسخے پر ہی ٹکی ہوئی ہیں جب اس کے منہ سے نکلتا ہے: ''ہر ایک کی قیمت پانچ سو نوے تومان۔''

''ہر پتہ؟''

''نہیں تو کیا ہر کاٹن کی قیمت! ہر عدد کی قیمت میری جان۔ ہر عدد کی قیمت میرے پیارے۔ دو پتوں کی قیمت بن جاتی ہے چودہ ہزار ایک سو ساٹھ تومان اور مہربانی فرما کر پہلے آپ وہ ایک سو ساٹھ تومان دے دیں۔''

شام ہو چکی ہے اور میں پانچ میں سے صرف تین دواؤں کا بندوبست کر کے انہیں جیرفت پوسٹ کر سکا ہوں۔ گھر پہنچتا ہوں تو میرا سر ابھی تک کے یاقوت میڈیسن،، جمشید تیار، ڈاکٹر یعقوب شراب اور ناصر خسرو قبادیانی اور ان جیسے دیگر ناموں سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں نلکا کھول کر اپنا سر نلکے کے نیچے لے جاتا ہوں تاکہ دماغ کو تھوڑی ٹھنڈک پہنچے۔ اُدھر میرے سر پر پانی گر رہا ہے اور اِدھر میں خواہ مخواہ اس سوچ میں ہوں کہ آخر اتنی ساری دوائیں کس لیے ہیں؟ انسان اتنا بیمار ہی کیوں پڑتا ہے؟ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور میں اپنا سر نلکے کے نیچے سے کھسکا لیتا ہوں۔ میرے سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔ ہال کے ایک کونے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی میز کی طرف دوڑ لگاتا ہوں، جس پر ٹیلیفون رکھا ہوا ہے۔ ریسیور اٹھاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے علی رضا ہے۔ اس کے ایک دوست کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اور اسے اسی وقت ہسپتال لے جانا ہے۔ اس کی اپنی گاڑی مکینک کے پاس ہے، سو مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ اگر مجھے ضرورت نہیں تو اپنی گاڑی اسے دے دوں۔ میں کہتا ہوں: ''میں اور میری گاڑی دونوں حاضر خدمت ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر بعد میں اس سڑک پر پہنچ چکا ہوں جو علی رضا کے گھر تک جاتی ہے۔ راستہ بھر میں اس سوچ میں ہوں کہ اس سے مل کر سایہ کا سوال بھی پوچھوں گا اور وہ سوال بھی جو نلکے کے نیچے میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ البتہ میں علی سے ہمیشہ سوالات پوچھتا رہتا ہوں؛ ایسے سوالات جن کے جوابات یا تو سرے سے ہیں ہی نہیں یا بہت مشکل ہیں۔ عام طور پر اس سے جوابات سن کر میری تشفی تو نہیں ہوتی لیکن باتوں باتوں میں کوئی جملہ ایسا بول دیتا ہے جسے سن کر مجھے بہت لطف آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے کسی بھی شخص سے گفتگو کر کے اتنا لطف نہیں آتا جتنا علی رضا سے بات کر کے آتا ہے۔ علی رضا سے سوال کرنا دراصل ایک بہانہ ہے تاکہ وہ بولنا شروع کرے۔ وہ ٹھہراؤ کے ساتھ سوچ سوچ

کر بولتا ہے۔ کنوارا ہے اور اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کے ساتھ ایک سو بیس میٹر کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ ہر چند کمپیوٹر کورس کروانے کے حوالے سے اسے کئی اداروں کی طرف سے آفر آئے ہیں لیکن اس نے ایک چھوٹے سے سرکاری ادارے میں بطور منیجر کام کرنے کو ترجیح دی ہے جہاں اس کا کام رفاہی امور کی نگرانی ہے۔

علی رضا گہرے رنگ کی پینٹ اور ہلکے رنگ شرٹ کے ساتھ ایک درخت سے ٹیک لگائے میرا منتظر ہے جو اس نے سبز کوٹ کے نیچے پہن رکھی ہے۔ آ کر میری گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔

''السلام علیکم یونس، ٹھیک ہو؟''

میں مسکراتا ہوں اور کچھ نہیں کہتا۔ منصور کے گھر کا ایڈریس بتا کر دوبارہ پوچھتا ہے:

''کیسے ہو؟''

باہر تیز ہوا درختوں کے درمیان سے گزر رہی ہے۔ فروری کے ابتدائی دن ہیں۔ شدید سردی ہے۔ بارش کے ننھے ننھے قطرے گاڑی کے فرنٹ شیشے سے ٹکرا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں: ''میرا حال کبھی اتنا برا نہیں تھا جتنا اب ہے۔'' پھر کوئی بھی دوسری بات کیے بغیر اس سے پوچھتا ہوں: ''انسانوں میں اتنی ساری بیماریاں کیوں پھیلی ہوئی ہیں؟ سر درد اور آدھے سر درد سے لے کر سائنوسائٹس تک کئی اقسام سر درد، دور یا نزدیک نظر کی کمزوری، رنگ کورا ہونا، آنکھوں میں موتیا اتر آنا وغیرہ جیسی آنکھوں کی بیماریاں، عدم ستادِ نظر سے لے کر ہارٹ بیٹ پرابلم تک، دل کے بڑے ہو جانے اور دل کی رگیں تنگ ہو جانے جیسے قلبی امراض، گردے یا مثانے کی پتھری، بانجھ پن، مرگی، گھنٹیا، گردن توڑ بخار، چیچک، گلسوئے، خسرہ، لال بخار، دمہ، مختلف پیدائشی امراض جیسے اندھا پن، بھینگا پن، بہرا پن، فالج اور زبان کی لکنت، ہیپاٹائٹس اے، بی اور سی، خون کی بیماریاں جیسے ہیموفیلیا، لیوکیمیا، تھلیسیمیا، مختلف ذہنی بیماریاں اور برتاؤ کے حوالے سے پسماندگی جیسے السر، آنتوں کا زخم، طفیلی بیماریاں، رگوں کی بیماریاں، خناق، ٹائیفائیڈ، جوڑوں کا درد، ریڑھ کی ہڈی کی بیماری، پارکنسن کی بیماری، ذیابیطس، آلزائمر، شریانوں کی بے حسی سے لے کر اسٹروک تک۔۔۔ اوہ اوہ کتنی ساری بیماریاں ہیں!''

میں گاڑی کے وائپر چلاتا ہوں تاکہ بارش کے قطرے صاف کرسکیں۔ علی رضا شیشے سے
مسلسل باہر کی بند دکانیں دیکھ رہا ہے۔

"ہر کوئی مرنے سے پہلے ان میں سے چند بیماریوں کا تجربہ ضرور کرتا ہے۔ میری والدہ بھی سال سے رگوں کی بیماری اور دیابیطس کی شکار ہے۔ سایہ کو ہارٹ بیٹ پرابلم ہے، اس کے ابو کو آنتوں کا زخم لاحق ہے اور امی کو ایک دائمی سینوسائٹس ہے۔ ابو مرنے سے پہلے پارکنسن کی بیماری میں مبتلا تھے۔ مجھے نہیں لگتا کہ انسان سے زیادہ کوئی بھی جاندار اتنی ساری بیماریوں کی زد میں ہوگا۔ یہ سوال ہمیشہ میرے دماغ میں گھومتا رہتا ہے کہ حیوانات اتنے بیمار نہیں پڑتے جتنے انسان پڑتے ہیں؟"

پہلے تو علی رضا نے زیرِلب کچھ کہتا ہے جسے میں نہیں سن پاتا۔ پھر چند لمحوں تک مجھے گھورتے ہوئے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے: "تم اتنے سارے فرشتوں کے نام کیسے جانتے ہو؟" اس کی مراد بیماریوں سے ہے۔ میں کہتا ہوں: "یہ اگر فرشتے بھی ہوں تو یقیناً عذاب کے فرشتے ہوں گے!"

بارش تیز ہوگئی ہے اور سامنے سے آتی ہوئی گاڑیوں کی روشنی سے میری آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ علی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوجاتا ہے اور پھر بولنا شروع کردیتا ہے: "کیا فرق پڑتا ہے۔ سارے فرشتے اچھے ہیں؛ رحمت کے بھی اور عذاب کے بھی۔"

دور افق پار تھوڑی گرج چمک ہوتی ہے۔ میں اچانک پوچھ لیتا ہوں: 'کیا واقعی فرشتے ہیں؟ کیا سچ میں اس وقت میرے کندھوں پر دو فرشتے بیٹھ کر میرے اعمال کسی تختی پر لکھ رہے ہیں؟ تم واقعی ان باتوں کو مانتے ہو؟"

علی رضا گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہتا ہے: "میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اپنے کندھوں پر ان فرشتوں کی موجودگی کا وزن تک محسوس کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو فرشتوں کی خوشبو بھی پہچان سکتے ہیں اور جو ان کے پھڑپھڑانے کی آوازیں بھی سن سکتے ہیں لیکن یہ باتیں اہم نہیں ہیں، اصلی اور اہم بات یہ ہے کہ۔۔۔"

وہ اپنی بات پوری نہیں کرتا۔ جیسے اچانک اس کا دل بھر آیا ہو۔ وہ چپ ہوجاتا ہے۔ مجھے

اچھی طرح پتہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنی بات پر مصر ہونا اچھا نہیں ہوتا۔

ہم علی رضا کے دوست یعنی منصور کے گھر پہنچتے ہیں۔علی رضا گھر کے اندر چلا جاتا ہے اور چند لمحوں کے بعد ایک ہڈیوں کے ڈھانچے جیسے نوجوان کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے باہر آتا ہے اور اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیتا ہے۔خود بھی پچھلی سیٹ پر اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔

پھر کہتا ہے: ''جلدی چلو!''

منصور پوری طرح بے ہوش لگ رہا ہے۔ بارش موسلا دھار برس رہی ہے اور میرے لیے راستہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔میں گاڑی کے آئینے میں دیکھتا ہوں۔علی رضا اپنا سر منصور کے سینے پر رکھ کر اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کر رہا ہے۔میں گاڑی ایک ایسی سڑک کی طرف موڑتا ہوں جس کی چڑھائی بہت زیادہ ہے۔گیئر بدلتا ہوں کہ چڑھائی آسانی سے چڑھ سکوں۔ کچھ دیر بعد بارش رکتی ہے تو میں گاڑی کے شیشے کرتا ہوں۔گاڑی اچانک سفید یاسمنوں کے پھولوں کی خوشبو سے بھر جاتی ہے تاہم سڑک کے دونوں کنارے سپیداروں سے، اونچی اونچی عمارتوں سے، ایسی دکانوں سے جن کے شٹر ڈاؤن ہیں اور فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے بے گھروں سے بھرے ہوئے ہیں۔کہیں کوئی یاسمن نہیں ہیں۔

۱۰

جب ایمرجنسی وارڈ کا نوجوان ڈاکٹر کہتا ہے کہ منصور دس منٹ پہلے ہی فوت ہو چکا ہے، تو علی رضا جھکتا ہے، اپنا چہرہ منصور کے ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے۔ پہلے تو اس کے کندھے ہلنے لگتے ہیں اور پھر مدتوں سے رو کے ہوئے آنسو اچانک اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ نوجوان ڈاکٹر ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں موت کی وجہ ''ہارٹ فیل ہونا'' لکھتا ہے۔ علی ڈاکومنٹس پر دستخط کر دیتا ہے اور ایک نرس کی مدد سے منصور کو اسٹریچر پر لٹا کر سرد خانے کی طرف لے جاتا ہے۔

رات کے دو بج رہے ہیں۔ میں ایمرجنسی وارڈ کی کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو ایک خاتون سراسیمگی کی حالت میں ٹیلیفون بوتھ کی طرف دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں پتہ نہیں اس وقت منصور کہاں ہوگا؟ میں نے منصور کا نام کئی بار علی رضا سے سنا تھا لیکن یہ پہلی اور آخری بار تھی جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ ایمرجنسی وارڈ خالی ہے اور میرے علاوہ دوسرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں ہسپتال کے کوریڈور میں بلامقصد ٹہل رہا ہوں۔ آپریشن تھیٹر سے گزر کر اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں۔ شیشے کا ایک بڑا سا دروازہ جس پر ''نیورولوجی اور سائیکاٹری'' لکھا ہوا ہے، کھولتا ہوں اور اندر داخل ہوتا ہوں۔ کوریڈور میں لوہے کی بینچ پر ہسپتال کے کپڑوں میں ملبوس دو افراد بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ پہلا ایک بوڑھا ہے جس نے سرمئی رنگ کی ہاتھ سے بنی ہوئی ایک ٹوپی

پہنی ہے اور اسے کھینچ کر اس سے اپنے کان ڈھانپ دیے ہیں۔ بوڑھا اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے مخاطب ہو کر باتیں کر رہا ہے لیکن یوں لگ رہا ہے جیسے وہ ایک دوسرے کی بات نہیں سن رہے ہیں۔ بوڑھا بار بار اپنا سر ہلاتا اور کہتا ہے:

''میرا خیال ہے کہ ہم ابھی راستے میں تھے، جب میں نے اس سے پوچھا تو میرا کیا بنے گا؟ میں نے اس سے کہا کہ تم حتیٰ کہ معمولی سے معمولی کھانے کو بھی مجھ پر فوقیت دیتی ہو۔ پتہ ہے اس نے کیا کیا؟ باورچی خانے میں دوڑ لگائی اور دراز سے ایک چاقو نکالا اور کہا: ''بکواس بند کرو! بکواس بند کرو! بکواس بند کرو!' کہا اگر تم چپ نہیں ہوئے تو اسی چاقو سے تمھارا کام تمام کر دوں گی۔''

دوسرا ایک ادھیڑ عمر شخص ہے جس نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی ہے اور فون پر بات کرنے والے شخص کی اداکاری کر رہا ہے۔ اس نے اپنا ٹھینگا کان میں دبا رکھا ہے اور چھوٹی انگلی منہ کے قریب لا کر کہہ رہا ہے:

''۔۔۔یس سر، بالکل سر۔۔۔ جو حکم سر۔ میں؟ میری کیا اوقات سر؟ میں آپ کے قربان جاؤں سر۔ آپ سلامت رہیں سر۔ گھڑی کی کیا مجال کہ ساڑھے تین بجائے۔ ٹائم وہی ہے جو آپ کہیں سر۔ ہم نے شیشوں کو بھی حکم دے دیا ہے کہ اپنی دوسری طرف نہ دکھائیں۔ لیکن سر اگر انھوں نے پھر بھی دکھایا تو؟ تو ہم پتھر مار کر ان کی گردن توڑ دیں گے سر۔ ہم نے مرغوں کو بھی ڈرا دھمکا دیا ہے اور بعض کو مطیع بھی بنا دیا ہے کہ صبح بانگ نہ دیا کریں۔ ہم نے انھیں بتا دیا ہے کہ صرف دوپہر سے پہلے پہلے انھیں اجازت ہے کہ اتنے ککڑوکڑوں کریں کہ ان کا دم نکل جائے۔ کتوں کو بھی حکم دیا ہے کہ صرف دن کے وقت بھونکا کریں اور راتوں کو انسان کا بچہ بن کر آرام سے سوئے پڑے رہیں۔ شوکیس میں سر؟ ہم نے شوکیس میں سب کچھ رکھا ہے، مچھلی کے دودھ سے لے کر انسان کی جان تک، سب کچھ۔''

''وہ بولی: 'ہیٹر بند کرو اور اپنی گولیاں کھا لو۔' میں بولا: 'بہت ٹھنڈ ہے، سو میں ہیٹر بند نہیں کروں گا۔ میں سو گولیاں کھانے کے لیے بھی تیار ہوں، تم بس ایک بار، بس ایک بار کہہ دو کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے۔ میں اتنی ساری نیند کی گولیاں کھا لوں گا کہ اگلے سو سال، نہیں اگلے ہزار سال تک نہ جاگ پاؤں۔' پتہ ہے کیا بولی: 'اس نے کہا: دفع ہو جاؤ۔ میں تمھارا مرا ہوا منہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

"میں نے مبارک کو شوکیس کے سارے شیشے اچھے سے چمکانے کو کہا ہے۔ تعمیدار ہوں سر۔غلام ہوں آپ کا سر۔صبح سویرے اگر چڑیوں نے چہچہا کر آپ کی نیند خراب کرنے کی کوشش کی تو ہم ان کا گلا گھونٹ دیں گے۔اس موضوع کے بارے میں بھی آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ہم نے پڑوسیوں کے سارے درختوں کو بتا دیا ہے کہ اس کے بعد اپنے سائے صرف ہمارے صحن میں ڈالا کریں۔بجلی کے کھمبوں کو بھی بتا دیا ہے کہ آئندہ ہمارا احترام کریں۔تتلیاں سے ساری بلیاں دن میں تین بار ایوان کے سامنے آ کر سلامی دیا کریں گی سر۔"

"میں نے کہا کہ دیکھو تو میرے ہاتھ خالی ہیں! لیکن اس بے وفا نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔حوض کے کنارے بیٹھ گئی۔ایک سرخ مچھلی پکڑی اور اسے بلی کے آگے ڈال دیا۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھا زور زور سے رونا شروع کر دیتا ہے۔اس کے رونے کی آواز سن کر ایک نرس کوریڈور کے انتہائی حصے سے پانی کا ایک گلاس ہاتھوں میں لیے ان دونوں کی طرف آتی ہے۔نرس کو دیکھ کر بوڑھا چپ ہو جاتا ہے۔نرس دونوں کو ایک ایک گولی دیتی ہے اور انھیں اپنے اپنے کمرے میں لے جاتی ہے۔عینک لگائے ہوئے شخص کا ہاتھ ابھی تک موبائل فون کی سی حالت میں ہے اور وہاں سے دور ہوتے ہوئے زور سے چلانے لگتا ہے: "سب ان جھینگروں کا قصور ہے سر جو ایک لمحے کے لیے بھی چپ نہیں بیٹھتے۔شام سے صبح تک شور مچاتے ہیں۔یس سر، زہر کا چھڑکاؤ ضروری ہے۔انھیں ہزار بار مارنا اور پھر جلا کر راکھ کر دینا چاہیے سر۔۔۔"

گولی اپنا اثر دکھا رہی ہے اور مرد پر خواب اور بیداری کی سی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ اب وہ اپنے الفاظ ٹھیک سے ادا نہیں کر پا رہا ہے۔خواب آلودہ لہجے میں بولتا ہے: "اااا گرررر اننننہیں مااااارا نننننہیں تو ان ککلکے شووووور سے ے ے ے راااات بھر ککلکو نی بھیییی نہیں سووووو پاااااااائے ے ے ے ے ے ے ے گا، سررررر!"

صبح کے چار بج رہے ہیں اور میں ابھی تک ان دو افراد کے بارے میں سوچ رہا ہوں جنھیں نیورولوجی وارڈ میں دیکھا تھا۔ہم دونوں گاڑی کی طرف بڑھتے ہیں۔مسلسل جاگتے رہنے کی وجہ

سے میری آنکھیں جل رہی ہیں۔ میں علی رضا کو گاڑی چلانے کو کہتا ہوں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہیں تو میں اپنی سیٹ لٹا دیتا ہوں۔ علی رضا جنگ، فرنٹ لائن، چزابہ کے تنگ اور زگ زیگ کی شکل کی کھائیوں کی باتیں شروع کر دیتا ہے، وہ کھائیاں جو ایک اجتماعی قبر کی طرح لمبی اور تنگ ہیں۔ جوانوں پر دن رات برسنے والے توپ کے گولوں، مارٹر اور آر پی جی کے بارے میں بتاتا ہے۔ کھائیوں کے اندر بنائے ہوئے خطوط کے بارے میں بتاتا ہے جس سے محرابوں کا کام لیا جاتا تھا۔ بے شمار، بے شمار اور بے شمار مرنے والوں کی بابت بتاتا ہے جو ہر دن اور ہر رات جنگی کھائی میں مر جاتے تھے۔ خون کی اس خوشبو کا قصہ سناتا ہے جو لوبیا کے ڈبوں سے زیادہ ان کے مشاموں سے ٹکرایا کرتی تھی۔ اس دوپہر کی کہانی سناتا ہے جب اچانک ایک راکٹ جنگی کھائی کے ایک حصے میں گرا اور وہ سراسیمگی کی حالت میں کئی سو میٹر کھائی کے اندر زگ زیگ انداز میں دوڑا اور ایک محراب میں اسے منصور نظر آیا جس کی ریڑھ کی ہڈی میں بم کے پرخچے لگے تھے اور اس نے ضعف اور کمزوری کی وجہ سے جنگی کھائی کی خاکی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

علی رضا ایک منٹ تک خاموش ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ بولنے لگتا ہے: ''جب میں اوپر گیا تو اس کی امی نے بتایا کہ وہ ٹیلی ویژن پر جنگ کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری دیکھ رہا تھا جب اچانک اس پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔''

میں گاڑی کا شیشہ نیچے لاتا ہوں۔ اچانک گاڑی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بھر جاتی ہے۔

علی رضا اپنی بات جاری رکھتا ہے: ''ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ایسی فلمیں دیکھنا اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔''

میں اپنا ہاتھ گاڑی سے باہر نکالتا ہوں۔ بارش مکمل طور پر بند ہو چکی ہے۔ میں نیم بیداری کی حالت میں ہوں۔ اچانک سامنے سے تیز روشنی میں آتے ہوئے ٹرک کی روشنی سے مشابہ ایک روشنی میری آنکھوں سے ٹکراتی ہے، لیکن کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی مجھے ٹرک کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں۔ سڑک پر کوئی گاڑی نہیں ہے۔ علی رضا اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتا ہے: ''کیا ہوا؟''

11

میری آنکھ کھلتی ہے تو صبح کے دس بج رہے ہیں۔کل رات کا واقعہ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح میرے ذہن میں گھوم رہا ہے۔صبح سویرے جب علی نے مجھے میرے اپارٹمنٹ پہنچایا تو میں نے اپنی کار اسے دے دی تا کہ اگلے چند دنوں میں تدفین کی بھاگ دوڑ میں اس کے کام آئے۔
جیسے ہی میں باورچی خانے میں جاتا ہوں، دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔دروازہ کھولتا ہوں تو سامنے سایہ کھڑی ہے۔خوبصورت کریپ کی کالی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔کرسی پر بیٹھتی ہے تو چادر ڈھلک کر اس کے کندھوں پر گر جاتی ہے۔آج کچھ زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے۔اس نے ناشتہ نہیں کیا ہے۔میں واش بیسن کی طرف جاتے ہوئے اس سے پوچھتا ہوں: ''اور سناؤ، تمھارا تھیسز کیسے چل رہا ہے؟'' وہ کچھ کہتی ہے لیکن اس کی باتیں بہتے ہوئے پانی کے شور میں بہہ جاتی ہیں۔میں نلکا بند کرتا ہوں اور ٹوتھ برش کرتے ہوئے ہال میں آجاتا ہوں تا کہ اس کی آواز بہتر طور پر سن سکوں۔وہ ایک چھوٹا سا لیتھوگرافی کا نسخہ اپنے پرس سے باہر نکالتی ہے اور خدا اور موسیٰ کے درمیان ہونے والا ایک مکالمہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے:

''اے عمران کے بیٹے! جب بھی میرا کوئی بندہ مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی فریاد اس طرح سنتا ہوں گویا اس کے علاوہ میرا کوئی اور بندہ نہیں ہے، لیکن تعجب ہے کہ میرا بندہ سب کو یوں

پکارتا ہے جیسے میرے علاوہ سب اس کے خدا ہیں۔"

میں مسکراتے ہوئے دوبارہ واش بیسن کی طرف جاتا ہوں۔صابن سے چہرہ دھوتا ہوں اور پھر تولیہ اپنے ساتھ ہال ہی میں آتا ہوں اور سایہ کے روبرو اور کھڑکی کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھ جاتا ہوں۔سورج کی روشنی کھڑکی کے راستے سایہ کے چہرے پر پڑ رہی ہے جس سے اس کا چہرہ روشن ہوگیا ہے۔میں تولیے سے اپنا چہرہ خشک کرتا اور سایہ کو تکنے لگتا ہوں جو اپنے ڈھیر سارے کاغذات میں کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔اچانک وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر اسے پڑھنا شروع کردیتی ہے:

"سوچو تم موسمِ سرما کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات میں اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ صحرا میں راستہ بھول گئے ہو۔رات بغیر چاندنی کے اور اتنی تاریک ہے کہ اگر تم دونوں ایک دوسرے سے ذرا بھی دور ہو جاؤ تو ایک دوسرے کو صدا دیے بغیر نہیں ڈھونڈ سکتے۔اس گھپ اندھیرے میں تمھیں دور سے کسی شعلے کی ٹمٹماہٹ دکھائی دیتی ہے اور تم اپنی بیوی کو اسی ٹھٹھرتی ہوئی تاریکی میں چھوڑ کر راستہ ڈھونڈنے کی امید لے کر اس روشنی کی طرف بڑھتے ہو۔شعلے کے پاس پہنچ کر خوف سے تمھاری روح بدن سے نکلنے لگتی ہے: وہ کوئی شعلہ نہیں ہے، ایک آگ ہے، جس کا کوئی دھواں نہیں اور جو ایک درخت کے شاخوں سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہے۔تم خوف زدہ ہو کر الٹے پاؤں صحرا کی اسی تاریکی کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔کچھ دور جا کر رک جاتے ہو۔تمھاری سانسیں پھولی ہوئی ہیں۔تم ایک بار پھر اس درخت کی طرف بڑھتے ہو۔اس بار تمھیں ایک عجیب وغریب آواز سنائی دیتی ہے، گویا اس نے ستاروں کی جھرمٹ سے اس درخت تک کا سفر طے کیا ہے:

إِنِّیٓ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى۔ وَ أَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَى۔

میں ہی آپ کا رب ہوں، پس اپنی جوتیاں اتار دیں، بہ تحقیق آپ طویٰ کی مقدس وادی میں ہیں۔اور میں نے آپ کو منتخب کرلیا ہے لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے اُسے سنیں۔"

سایہ کا چہرہ سرخ ہونے لگتا ہے جسے دیکھ کر میں پریشان ہو جاتا ہوں۔وہ اپنی بات جاری رکھتی ہے:

"وہی آواز تم سے خطاب کر کے کہتی ہے کہ اپنا ہاتھ اپنے بغل میں ڈال کر باہر نکالو تا کہ اپنے ہاتھ کو سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھو۔ اب نہ صرف تمہارا راستہ، بلکہ تم خود بھی روشن ہو چکے ہو۔ تم اپنی بیوی کے پاس واپس لوٹ جاتے ہو اور وہ تم سے پوچھتی ہے: تم نے راستہ ڈھونڈ لیا؟ اور تم اپنے وجود کی اتھاہ گہرائیوں سے کہتے ہو: ڈھونڈ لیا، ڈھونڈ لیا، ڈھونڈ لیا۔"

میں سایہ کے سینے پر سونے کی پلیٹ کو دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہوں: "تم خوش نصیب ہو۔"

وہ مسکرا کر جواب دیتی ہے: "آپ بھی۔"

میں ہاتھ بڑھا کر اس کے سینے پر سجی ہوئی سونے کی پلیٹ کو اپنی انگلیوں کے بیچ دباتا ہوں۔ یہ تحفہ ہمیں علی رضا نے ہماری نکاح کی رات دیا تھا۔ پلیٹ پر علی کا لفظ نہایت خوبصورتی سے کندہ کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں: "تم خوش نصیب ہو۔ علی بھی خوش نصیب ہے۔ منصور بھی۔ حضرت موسیٰ (ع) بھی خوش نصیب تھے۔"

سایہ دوبارہ ہنستے ہوئے کہتی ہے: "حضرت موسیٰ (ع) کے بارے میں آپ نے بالکل صحیح کہا۔ خدا نے جس شخص کا ذکر قرآن کی بیس سورتوں میں کیا ہو اور ایک سو اکتیس بار اس کا نام لیا ہو، یقیناً خوش قسمت انسان ہوگا۔ آپ کے بقول جو دنیا کا واحد ایسا انسان ہو جس نے خدا کی آواز سنی ہو، یقیناً خوش نصیب انسان ہوگا۔" میں اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ان پر اپنا ماتھا رکھ دیتا ہوں۔

اس وقت میرے دل میں عجیب احمقانہ خیال آ رہا ہے۔ میرا من کر رہا تھا کہ کسی رات میں اور سایہ بھی کسی ایسے ہی سرد اور گھپ اندھیرے صحرا میں کھو جائیں۔

میں کیتلی چولہے پر رکھ کر اس کے نیچے آگ جلاتا ہوں۔ سارے کپڑے پر سلیقے سے رکھ دیتا ہوں۔ ادھر سایہ کچن الماری سے تھرموس نکالتی اور کہتی ہے: "حضرت موسیٰ (ع) اپنی قوم کے ستر لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تا کہ وہ ان کے اور خدا کے درمیان ہونے والے مکالمے کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔" میں کافی اور چینی برتن ٹرے پر رکھتا ہوں۔ "تاہم ان کی قوم کے نادان منتخب

لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔" میں چولہا بند کر دیتا ہوں اور تھرموس میں چند چمک خشک چائے ڈالتا ہوں۔" خدا نے موسیٰ سے کہا کہ میں پہاڑ پر تجلی کروں گا۔ اگر پہاڑ اپنی جگہ برقرار رہا تو پھر تم لوگ بھی مجھے دیکھ پاؤ گے۔" میں ایک مکھن اور روٹی کے چند ٹکڑے فریزر سے نکالتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچنے لگتا ہوں کہ سایہ کے لیے یہ پراجیکٹ کچھ زیادہ بھاری ہے۔ ٹرے سایہ کے حوالے کر کے تھرموس میں ابلا ہوا پانی ڈالتا ہوں۔ پھر چند عدد پیسٹری اور دو بوتل پاسچرائزڈ دودھ بھی فریج سے باہر نکالتا ہوں۔

میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہتا ہوں: "تمھیں کیا لگتا ہے؟ کیا خدا نے واقعی اس پہاڑ پر تجلی کی تھی؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تمھیں یقین ہے کہ خدا نے پہاڑ پر تجلی کی تھی؟" سایہ سپاٹ نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔

مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا بک رہا ہوں: "کیا تم سچ میں اپنے ان کہے ہوئے افسانوں پر یقین رکھتی ہو؟"

اسے لگتا ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں، مسکراتے ہوئے بولتی ہے: "یونس یہ باتیں افسانہ نہیں ہیں۔"

میں اور اونچی آواز میں کہتا ہوں: "بالکل ہیں!"

وہ سارے کاغذ واپس اپنے پرس میں رکھ دیتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ذرا ڈری ہوئی ہے: "حتیٰ اگر یہ باتیں افسانہ بھی ہوں تو بھی میں نے ان میں سے کئی باتیں خود آپ سے سیکھی ہیں۔"

میں پیالیوں میں چائے ڈال کر کہتا ہوں: "کون سے والے مجھ سے؟ آج والے مجھ میں اور کل والے مجھ میں کئی برسوں کا فاصلہ ہے۔ میں جو کچھ اس وقت سمجھ گیا ہوں یہ ہے کہ یہ ساری باتیں فسانہ ہیں۔"

کہتی ہے: "آپ کل رات دیر تک جاگتے رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں غصے سے پھٹ پڑتا ہوں اور چلا کر کہتا ہوں: "تمھارا مطلب ہے کہ میں پاگل ہوگیا

ہوں؟ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ جو شخص بھی توہم پرستی اور ادھر اُدھر کی باتوں سے ایک قدم آگے بڑھنا چاہے یا تو اسے پاگل قرار دیتے ہیں، یا اس پر ملحد کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے یا پھر روشن خیالی کی مہر لگائی جاتی ہے۔ نہیں، اتفاق سے اس وقت میری طبیعت جتنی ٹھیک اور اچھی ہے، اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔"

منگنی کے ان دو برسوں کے دوران میں کبھی سایہ پر نہیں چلایا۔ سایہ اپنی انگلیاں آپس میں الجھا دیتی ہے: "کیا مطلب توہم پرستی اور ادھر اُدھر کی باتیں؟ یونس! کچھ اندازہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل اندازہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایک زمانے میں میں ان چیزوں کو مانتا تھا لیکن اب میں ان باتوں پر رتی بھر بھی یقین نہیں کر سکتا جنھیں تم، علی اور پتہ نہیں کتنے اور لوگ مانتے ہیں۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں خود بھی اس کیفیت سے خوش نہیں ہوں جو مجھے درپیش آئی ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ان باتوں کا جاننا ضروری تھا۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اس نے خدا کے بارے میں بعض ایسی باتیں پوچھتی ہے جن کے جوابات دیتے ہوئے میں لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ اپنا شک چھپاؤں لیکن ہر بار ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میری باتیں اسے کتنی کڑوی لگ رہی ہیں۔ میز پر رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں: "کہاں جا رہی ہو؟"

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی ہیں۔ وہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں۔ جب اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کرتی ہے تو میں چلاتا ہوں: "سایہ!"

میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ کوریڈور میں اسے دوبارہ آواز دیتی ہوں۔ وہ پھر میری طرف نہیں دیکھتی اور لفٹ کے اندر چلی جاتی ہے۔ میں دوبارہ باورچی خانے میں آجاتا ہوں اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر سایہ کی خالی کرسی کو گھورنے لگتا ہوں جو ناشتے کی میز سے تھوڑے فاصلے پر ٹیڑھی شکل میں پڑی ہوئی ہے۔ میں بس چائے کی پیالیوں، ٹرے پر رکھی چمچیوں اور دودھ کی ان بوتلوں کو گھورنے لگتا ہوں جو ایک دوسرے کے پاس کھڑی یوں لگ رہی ہیں جیسے انسان ہوں جن کے سر کاٹ دیے گئے ہوں لیکن انھوں نے اُف تک نہ کی ہو۔

۱۲

پچھلے تین دنوں سے سایہ کا فون تک نہیں آیا۔ میں نے پارسا کے گھر کا ایڈریس لے لیا ہے۔ مہرداد کو فون کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہے تو ہم دونوں ایک ساتھ پارسا کے گھر جا سکتے ہیں۔ جمعے کا دن ہے۔ دوپہر سے پہلے پہلے ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر پارسا کے گھر کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ریڈیو پر بیس سوالات پر مبنی مقابلہ جاری ہے جس کا آخری جواب ''ہاں'' ہے۔

میں مہرداد سے کہتا ہوں: ''آخر کار تم نے اپنے ایران آنے کی وجہ نہیں بتائی۔''

وہ اپنی عینک اتارتا ہے، اسے اپنی پینٹ کی بڑی سی جیب میں رکھتا ہے اور کہتا ہے :

''میں امی کو فلوریڈا لے جانے آیا ہوں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جولی کے زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے گاڑی کے شیشے سے باہر جھانکتا ہے۔ ہم دونوں ٹریفک میں پھنسے ہوئے ہیں اور سامنے والی بس کے ایگزاز سے کالا دھواں نکال رہا ہے۔

مہرداد گاڑی کا شیشہ اوپر کرتے ہوئے کہتا ہے: ''میں چاہتا ہوں کہ جولی کے جانے کے بعد امی ہمارے ساتھ رہیں۔ میری بیٹی جوانا کو امی سے ملنے کا بہت شوق ہے۔''

ریڈیو مقابلے میں شریک کرنے والا پوچھتا ہے: ''کیا یہ چیز ہر گھر میں موجود ہے؟''

ہم دونوں ''کہانی شہر'' سینما کے پاس اتر کر سڑک کے شمالی حصے کی طرف بڑھنے لگتے

ہیں۔ پارسا کے گھر پہنچنے سے پہلے میں مہرداد کو منصور کے بارے میں بتاتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک ایران میں ایک بار علی رضا سے ضرور ملنا چاہتا ہے۔ دوپہر ہوگئی ہے اور دور سے اذان کی کمزور آواز کانوں سے ٹکرانے لگی ہے۔

پارسا کی والدہ فخریہ خانم ایک رکھ رکھاؤ والی نہایت باوقار خاتون ہے۔ جیسے ہی میں نے اپنا نام بتاتا ہوں، وہ بڑی خوش روی سے ہمیں بیٹھک میں لے جاتی ہے۔ کھڑکی کے دونوں کنارے پر سفید پردے ہک سے ٹنگے ہوئے ہیں۔ مہرداد ایک سگریٹ سلگاتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے اپنی بیٹی جوانا بہت یاد آرہی ہے اور وہ آج سہ پہر فون پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

استنے میں فخریہ خانم ہاتھوں میں ایک ٹرے لیے جس پر چائے کی دو پیالیاں رکھی ہوئی ہیں، آتی ہے اور آ کر ہمارے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس نے سر پر کالے رنگ کی جالی اوڑھ رکھی ہے۔ میں کہتا ہوں: ''ڈاکٹر پارسا ہمارا علمی سرمایہ اور ہمارے لیے باعثِ فخر تھے۔ ان کی وفات یونیورسٹی اور معاشرے کے لیے ناقابلِ ازالہ نقصان ہے۔''

وہ کچھ نہیں کہتی۔ میں اپنے روبرو دیوار پر نصب پارسا کی تصویر کو دیکھتا ہوں جو اس تصویر میں اپنی فائل کی نسبت زیادہ جوان لگ رہا ہے۔

''مجھے امید ہے کہ میری علمی تحقیق ایسے حادثوں کو کم کرنے میں مؤثر ثابت ہوگی۔''

مہرداد اپنی سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتا ہے اور میری مدد کے لیے لب کشائی کرتا ہے: ''فخریہ خانم! آپ کے خیال میں ڈاکٹر نے ایسا کیوں کیا؟''

پارسا کی والدہ اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہتی ہے: ''مجھے نہیں معلوم۔۔۔ واقعی میں کچھ نہیں جانتی۔ اپنے والد کرنل پارسا کی وفات کے بعد محسن صرف میرے لیے امریکہ سے ایران آیا تھا۔ محسن ہمارا اکلوتا بیٹا تھا، اسی لیے میری اور اس کے ابو کی خواہش تھی کہ اسے زندگی میں ہر طرح کا عیش و آرام ملے۔ تاہم اس کے ابو اسے ہر شخص سے دوستی کرنے یا ہر جگہ آنے جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہماری پوری کوشش یہی تھی کہ ہم معاشرے کو ایک صحت مند اور مہذب بیٹا دیں لیکن

آپ نے دیکھا کہ اسی معاشرے نے اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟"

اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتی ہیں۔ وہ سر پر اوڑھی کالی جالی سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہے۔

میں کہتا ہوں: "معاشرے سے آپ کی مراد کون ہے؟ کیا آپ اس حادثے میں کسی خاص شخص کو قصوروار مانتی ہیں؟"

"کرنل کے جانے کے بعد میں بہت اکیلی پڑ گئی تھی۔ محسن کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے میرے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو برباد کیا ہے۔ اس کی فائل میں لکھا ہے کہ میرے محسن نے ناامیدی اور زیادہ کام کے دباؤ کی وجہ سے ایسا کیا ہے، لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ محسن کبھی ناامید تھا ہی نہیں۔ اس نے کبھی اپنے کام کے حوالے سے کوئی شکایت نہیں کی۔ وہ ایک معقول اور منطقی شخص تھا۔ یہ بات ہمارے تمام رشتہ دار جانتے تھے کہ محسن کا برتاؤ بہت سنجیدہ اور سوچا سمجھا ہوتا ہے۔ وہ ہر شخص اور ہر چیز کو عملی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ آپ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، پی لیجیے!"

ہم ٹرے پر رکھی چائے کی پیالیاں اٹھاتے ہیں۔ "اس حادثے کے رونما ہونے سے پہلے آپ کو اس کے برتاؤ میں کسی قسم کی تبدیلی دکھائی نہیں دی؟ جیسے وہ غصیلا، زود رنج ہو گیا ہو، یا پھر بہانے بنانے لگا ہو؟"

فخریہ خانم اٹھتی ہے اور کمرے کی ایک دیوار پر ٹنگے ہوئے ایک چھوٹا سا فریم لا کر مجھے دکھاتی ہے۔ تصویر پارسا کی ہے جس میں اس نے ایک لمبے فٹے کو دونوں طرف سے دبا کر اتنا خم کر دیا ہے کہ فٹہ ٹوٹنے کے قریب پہنچ گیا ہے اور اسی حالت میں کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

"یہ تصویر میں نے اس کی موت سے تین ہفتے پہلے اتاری تھی۔ محسن ہمیشہ اسی طرح مسکراتا رہتا تھا جیسا آپ اس تصویر میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ہمیشہ شاداب رہتا تھا۔ ہر چند راتوں کو دیر تک جاگتا اور مطالعہ کرتا یا پھر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا، اس کے باوجود اگلی صبح چھ بجے جاگ جاتا تھا۔ وہ نہایت دقیق نظم اور پروگرام کے تحت زندگی گزار رہا تھا، بالکل ایک گھڑی کی طرح نظم وضبط کا پابند تھا۔ صبح جاگتے ہی پہلے تھوڑی دیر ورزش کرتا تھا، پھر نہا دھو کر ناشتا تیار ہونے تک اخبار پڑھتا تھا۔ کبھی کبھار اخبار پڑھنے کے بجائے ٹی وی پر خبریں سنتا تھا۔ وہ جب سے ایران آیا تھا، اس کا یہی معمول تھا۔ بس

اپنی موت سے دو مہینے پہلے وہ کچھ اکیلا اکیلا سا ہو گیا تھا۔ صبح دیر سے جاگتا تھا اور ہمیشہ ورزش نہیں کرتا تھا۔ گھر پر ہوتا تو زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارتا تھا لیکن یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ ایک ماہر نفسیات کے پاس بھی گیا تھا لیکن ڈاکٹر نے بھی کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

مہرداد اپنی سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہتا ہے: "فخریہ صاحبہ، میں اپنے اس سوال کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں لیکن کیا آخری دنوں میں وہ کسی پر عاشق نہیں ہوئے تھے؟"

"آپ کا مطلب ہے کہ کسی پر اس کا دل آ گیا ہو؟ نہیں، مجھے نہیں لگتا۔ اگر محسن کا کسی پر دل آ گیا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔"

"آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ آپ کو اس بارے میں ضرور بتاتا؟"

"کیونکہ میری طرف سے اس کی شادی کے لیے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیش آنے والی نہیں تھی اور ایک ایسی بات مجھ سے چھپانے کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا اور محسن کو صرف اپنے کام سے عشق تھا۔ وہ صرف پڑھانے اور مطالعہ کرنے کا عاشق تھا۔ میرا محسن صحیح لفظوں میں علم کا شیدائی تھا۔"

میں پوچھتا ہوں: "کیا ہم اس کا کمرہ دیکھ سکتے ہیں؟"

"یقیناً۔ میں اس کی موت کے بعد کبھی اس کے کمرے میں نہیں گئی۔ اب بھی نہیں جانا چاہتی۔"

پارسا کی امی مجھے اور پارسا کو مہرداد کے کمرے تک لے جاتی ہے اور خود باورچی خانے میں چلی جاتی ہے۔ پارسا کا کمرہ عمارت کے مشرقی حصے میں ہے۔ تقریباً ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کا آدھا حصہ ٹیبل اور کمپیوٹر نے بھر دیا ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں کتاب کے چند شیلف پڑے ہوئے ہیں۔ سب سائنس کی کتابیں اور زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں۔ دیوار سے تصویر کے دو فریم بھی ٹنگے ہوئے ہیں، جن میں سے ایک پارسا کے والد کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر ہے جس میں وہ فوجی یونیفارم میں ملبوس دکھائی دے رہے ہیں جبکہ دوسری تصویر میکس پلینک (Max Planck) کی پنسل سے بنائی ہوئی اسکیچ ہے۔ میں نہایت تیزی سے میز پر پڑی پارسا کی کتابوں اور نوٹس کی ورق

گردانی کرنے لگتا ہوں۔ میز پر پڑے پارسا کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک موٹے نوٹس کو اٹھاتا ہوں۔نوٹس کے پہلے صفحے پر بڑی سی لکھائی میں لکھا ہوا ہے: انسانی مفاہیم کا ریاضیاتی تجزیہ۔ ٹیبل کیلینڈر کے ساتھ ایک چھوٹی سی کاپی بھی پڑی ہے جس میں پارسا اپنے روزانہ کی یادداشتیں لکھتا تھا۔میں نوٹس اور کاپی اٹھاتا ہوں تاکہ ان کا مطالعہ کرسکوں۔مہرداد مجھے اشارے سے کہتا ہے کہ شاید کمپیوٹر ہارڈ ڈسک میں بھی کچھ ضروری چیزیں پڑی ہوں۔میں سوچتا ہوں کمپیوٹر بعد میں چیک کرتا ہوں۔ہم دونوں کمرے سے باہر نکل آتے ہیں۔میں ہال میں فخریہ صاحبہ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ یہ نوٹس اور یادداشتیں بہت مختصر عرصے تک اور صرف مطالعے کی غرض سے مجھے بطور امانت دے دیں۔

وہ کہتی ہے: ''انھیں پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن پھر بھی اگر آپ کو لگتا ہے کہ یہ آپ کی مدد کرسکتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ آپ انھیں پڑھیں۔''

ہم اپارٹمنٹ پہنچتے ہیں تو دو بج رہے ہیں۔مہرداد سینڈوچ میز پر رکھتا ہے اور میں ریفریجریٹر سے دو عدد کولڈ ڈرنک نکالتا ہوں۔دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مہرداد کہتا ہے کہ اس نے اپنی امی کا پاسپورٹ بنوالیا ہے اور اب صرف ویزا لینا باقی ہے۔وہ بتاتا ہے کہ سفارت سوئٹزرلینڈ کے خیال میں، جو ایران میں امریکی مفادات کا محافظ ہے،اس کی امی کے بیرونِ ملک جانے پر کوئی پابندی نہیں کیونکہ وہ ایک بوڑھی بیمار عورت ہے۔دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مہرداد سگریٹ سلگاتا ہے تو میں کہتا ہوں: ''تم جوانا کو فون نہیں کروگے؟ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک بار اس کی آواز سن سکوں۔''

وہ کہتا ہے: ''اس کی فارسی زیادہ اچھی نہیں لیکن لہجہ بہت میٹھا ہے۔''

مہرداد فون کی طرف جاتا ہے اور میں صوفے پر لیٹ جاتا ہوں۔وہ نمبر ملانے لگتا ہے اور میں سایہ کے بارے میں سوچنا شروع کردیتا ہوں۔پھر امی کے بارے میں، پھر پارسا، پھر مونس، پھر علی،دوبارہ سایہ کے بارے میں، پھر منصور، پھر مہرداد، پھر اپنے تھیسز، پھر جولیا، پھر خدا۔۔۔

"Hi Joanna"

میں اپنی جگہ سے اچھلتا ہوں اور فون اسپیکر پر لگاتا ہوں تاکہ جوانا کی آواز سن سکوں۔ میں مہرداد سے کہتا ہوں کہ اپنی بیٹی سے کہے کہ فارسی میں بات کرے۔

"جووان! میرا ایک دوست یہاں بیٹھا ہوا ہے جو تمہاری آواز فارسی میں سننا چاہتا ہے۔ چلو بتاؤ نانی اماں کہاں ہیں؟"

"بینک تک گئی ہیں۔ ڈیڈ کیا آپ جاننا چاہیں گے کہ کل نرسری میں کیا ہوا؟"

"بالکل میری جان!"

"مایک نے ایک منٹ میں سو تک گنتی مکمل کی لیکن میں صرف تراسی تک گن پائی۔"

"تراسی بھی بہت ہے ڈیئر۔ میں جب تمہاری عمر کا تھا تو ایک منٹ میں ساٹھ تک بھی نہیں گن سکتا تھا۔"

"مارگریٹ پچیس سے زیادہ نہیں گن پائی کیونکہ اس کی زبان میں لکنت ہے۔ آئرس کہتی ہے کہ خدا ایک منٹ میں ہزار تک گنتی گن سکتا ہے؟ آئریس ٹھیک کہتی ہے ڈیڈ؟"

"ہاں جووان، میرا بھی خیال ہے کہ آئرس نے ٹھیک کہا ہے۔"

"ایلن کو جانتا؟ وہی جس نے گراؤنڈ میں جیکسن میڈم کے پرس سے آئینہ چرا کر اس سے دھوپ بچوں کی آنکھوں میں ڈالتی۔"

"اب اس نے کیا کیا جووان؟"

"کچھ نہیں کیا لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ خدا جو چاہے کر سکتا ہے۔ آلن نے کہا کہ خدا گولڈن گیٹ پر واقع بیالیس منزلہ عمارت ایک منٹ میں توڑ سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کوئلے سے لدی ہوئی ایک عظیم کشتی کو ایک پھونک مار کر ڈبو سکتا ہے یا جال کے بغیر ہی سمندر سے ہزار بڑی مچھلیاں پکڑ سکتا ہے۔"

مہرداد میری طرف دیکھتا اور ہنستے ہوئے اپنی بیٹی سے پوچھتا ہے: "تمہارا کیا خیال ہے جووان؟"

''اگرچہ پچھلے ہفتے ایلن نے میرا چیز سینڈوچ میرے ہاتھ سے چرایا تھا لیکن میرے خیال میں اس معاملے میں وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے جووان۔''

''ڈیڈ؟''

''کیا ہے ڈیئر؟''

''تو آپ کے خیال خدا جو چاہے کرسکتا ہے؟''

''بالکل جووان۔''

''یہاں تک کہ امی کو ابھی ٹھیک کرسکتا ہے؟''

مہرداد حیرت سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھتا ہے اور پھر کرسی سے ٹیک لگا کر کہتا ہے :

''Of course Honey''

۱۳

صبح کے نو بج رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر میر نصر سے ملتا ہوں البتہ اس کے لیے پہلے ہی اپوائنمنٹ لے لیا تھا۔ میں نے اس کا ایڈریس عدالت کے کاغذ کے اس ٹکڑے سے کاپی کیا تھا جو خودکشی کے وقت پارسا کی جیب میں ملا تھا۔ ڈاکٹر میر نصیر کا کلینک ایک اکیس منزلہ ٹاور کی ساتویں منزل پر واقع ہے۔ ہرچند وہ اٹھارہ مہینے پہلے اور صرف ایک بار پارسا سے ملا ہے، پھر بھی فیضی تفتیشی کے برعکس اسے پارسا کے خدوخال اچھی طرح یاد ہیں۔ اسے پارسا کی خودکشی کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں تو غم ناک ہونے سے زیادہ حیران ہوتا ہے۔ اپنی سیکریٹری کو فون کر کے کر کے کہتا ہے کہ پارسا کی فائل لے آئے۔

میں پوچھتا ہوں: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو معلوم ہی نہ ہو جبکہ تمام اخبارات میں اس کی خبر آ چکی ہے۔''

وہ وہ فرانسیسی پیالیوں میں قہوہ ڈالتا ہے اور پھر کہتا ہے: ''میں اخبار نہیں پڑھتا اور یہاں آنے والے لوگوں سے بھی کہتا ہوں کہ وہ بھی اخبار نہ پڑھا کریں۔'' پھر ایک پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہتا ہے: ''صرف اخبار ہی نہیں، بلکہ میرا ماننا ہے کہ ہر وہ چیز جو پڑھنے یا سننے والے کو ایک ساتھ پراگندہ اور نامنظم اطلاعات منتقل کرے، مضر ہے۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبار اور ڈش اینٹینا

ب کا کام یہی ہے کہ بمباری نہ بھی کریں تو بھی عام طور پر خواہ مخواہ کی خبریں بموں کی طرح آپ کے سروں پر برساتے رہتے ہیں۔ یہ جاننا کہ فلاں جگہ اسٹاک مارکیٹ میں کیا تبدیلی آئی ہے یا ہبل ٹیلی اسکوپ نے خلا کے دورترین حصے میں کیا دیکھا ہے یا نیبراسکا میں ہوائی جہاز گرنے سے پینسٹھ لوگ مر گئے ہیں یا حتیٰ کہ یہ بات جاننا کہ ڈنمارک کے ایک کسان کو ایک ایسی بلی ملی ہے جو سورج کی روشنی میں سبز ہو جاتی ہے اور سائے میں سرمئی رنگ اختیار کر لیتی ہے، ایسی باتیں جاننا ہمارے لیے کیا اہمیت رکھ سکتا ہے؟ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ایک عورت کے جڑواں بچے ہوئے ہیں یا ایک شخص نے غسل خانے کے ٹب میں اپنے دو بچوں کا گلا گھونٹ کر انھیں مار دیا ہے؟"

میں چمچ سے اپنا قہوہ ہلاتا ہوں اور مذاق کرتے ہوئے کہتا ہوں: "خبروں کی بارش جہالت کی خشک سالی سے تو بہر حال بہتر ہی ہے۔"

"میں متفق نہیں ہوں۔ خبروں کی بارش انسان کے علم کو آشفتہ کر دیتی ہے اور انسان کا علم آشفتہ ہو جائے تو وہ لاچار ہو جاتا ہے۔ پراگندہ دانائی جہالت سے بدتر ہے کیونکہ نہ جاننے میں بہر حال ایک طرح کا چین اور سکون تو ہے جو دانائی میں ناپید ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ ایک مخصوص بیماری میں مبتلا ہیں اور چند دنوں بعد مر جائیں گے تو آپ کی کیا حالت ہوگی؟ شاید ایسے بھی کچھ لوگ ہوں گے جو بعض چیزوں سے بے خبر رہنے کے لیے پیسے دینے کو بھی تیار ہیں۔"

میں اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا لیکن کچھ کہنا ضروری ہے، اس لیے کہتا ہوں:
"بہر حال آج کی دنیا میں آپ کے بقول اس معمولات کی بارش سے بچنا آسان نہیں ہے۔"

وہ قہوے کا ایک گھونٹ پی کر کہتا ہے: "میں مانتا ہوں کہ ایسا کرنا آسان نہیں تاہم میں خود موسیقی سننے یا حافظ کی ایک غزل پڑھنے کو اخبار پڑھنے یا خبریں دیکھنے پر ترجیح دیتا ہوں۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت بھرے معنی خیز لہجے میں کہتا ہوں:
"متفق!"

سیکریٹری کمرے میں داخل ہو کر پارسا کی فائل میز پر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر نصیر کمرے سے باہر

جاتی ہوئی اپنی سیکریٹری کو شرارت بھری نظروں سے دیکھ کر کہتا ہے: ''اس بھری دنیا میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو اخبار اور ٹیلی وژن سے بہتر ہیں؟ اتفاق کریں گے آپ؟''

میں مسکراتے ہوئے کہتا ہوں: ''اس وقت میرے لیے سب سے اہم چیز وہ فائل ہے جو آپ کے سامنے پڑی ہوئی ہے۔''

وہ فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہتا ہے: ''ہم ماہر نفسیات سچے ہمدردوں یا پادریوں یا بینک کے ملازمین کی طرح ہیں۔ دوسروں کے راز ہرگز فاش نہیں کرتے۔''

''مجھے یقین ہے آپ ایسی کسی کوشش کی مخالفت نہیں کریں گے جس سے معاشرے میں ایسے ابنارمل برتاؤ میں کمی آنے کا امکان ہو۔'' میں یونیورسٹی کا خط میز پر اس کے سامنے رکھتا ہوں اور ایک بار پھر اس تحقیق کے پیچھے اپنے مقصد کے بارے میں اسے بتاتا ہوں۔ پھر کہتا ہوں: ''اب تو ڈاکٹر پارسا زندہ بھی نہیں ہے۔ سو یہ فائل پڑھنے سے اسے نقصان کیسے پہنچ سکتا ہے؟''

وہ تھوڑی دیر سوچتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ وہ یہ فائل مجھے صرف پارسا کے گھر والوں کی تحریری اجازت سے ہی دے گا۔

میں ڈاکٹر میر نصر کے کلینک سے سیدھا تحقیقاتی ادارے میں اپنے دفتر پہنچتا ہوں۔ میری میز پر ادارے کے سربراہ کا ایک خط پڑا ہے۔ کام میں پیش رفت کی رپورٹ مانگی ہے۔ کیسی پیش رفت؟ میں کرسی میں دھنس جاتا ہوں۔ ٹیک لگاتا اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور پارسا کے شاگردوں، اس کی امی، عدالتی فائل اور کیوان بایرام سے ملنے والی معلومات کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ میرے ہاتھ کچھ نہیں آیا ہے۔

کھڑکی کی طرف جا کر نیچے جھانکنے لگتا ہوں۔ نیچے دو گاڑیوں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے جس سے سارا راستہ بند ہو گیا ہے۔ ان کے پیچھے بہت سی گاڑیاں ٹریفک میں پھنسی ہیں۔ حادثے سے فاصلے پر کھڑی بے خبر گاڑیاں پریشانی کے عالم میں مسلسل ہارن بجا رہی ہیں۔ وہاں سے کچھ دور ٹریفک نے ایک گاڑی کے وائپر کے نیچے جرمانے کی چٹ رکھتی ہے جسے گاڑی مالک نے بری نو پارکنگ ایریا میں کھڑی کی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور میں فوراً کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر ریسیور کی طرف

بڑھتا ہوں۔ دوسری طرف سے ایک ہلکی سی آواز آتی ہے۔ پہلے مجھے لگا سایہ ہے، لیکن نہیں، سایہ نہیں ہے:

''سب کچھ اچانک بگڑ گیا۔کھیل شروع ہوا تو میں دوڑی۔ وہ میرے پیچھے دوڑا۔ میں کہتی جاتی تھی کہ میں نہیں کھیل رہی لیکن وہ مسلسل دیکھ کے، دیکھ کے' کہہ رہا تھا۔ ہم سوئمنگ پول کے گرد دوڑ رہے تھے۔ اچانک میں نے اپنی رفتار بڑھائی۔ مجبوراً اسے بھی تیز دوڑنا پڑا۔ قسم سے میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں سوئمنگ پول کے کنارے کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا، وہاں مت جاؤ! لیکن میں نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ پھر وہ بھی سوئمنگ پول کے کنارے پر آگیا۔ میں اتنی دوڑی کہ اس کا سر چکرانے لگا۔ لیکن مجھے کوئی چکر نہیں آرہے تھے۔ قسم سے میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے لگا کہ شڑاپ سے پانی میں جا گرا اور بہت سا پانی اچھل کر میرے سر اور چہرے پر لگا۔''

وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کہوں رانگ نمبر ہے اور ریسیور رکھ دوں، اچانک تجسس کے مارے اس سے پوچھ لیتا ہوں: ''پھر کیا ہوا؟''

"water. ButNothing. Then I gradually stopped and stared at the

he never surfaced."

۱۴

میں کئی بار اپنی امی کو ٹیلی فون کرتا ہوں لیکن دوسری طرف سے کوئی بھی ریسیور نہیں اٹھاتا۔ مجھے تشویش ہونے لگی ہے۔ میں پلنگ پر لیٹ کر پارسا کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نوٹس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہوں۔ پارسا نے اپنے نوٹس کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ہر چند اس پراجیکٹ کی تکمیل میں اس نے اپنے دوستوں سے (جو تمام کے تمام ریاضیات، سوشل سائنسز، سوشیالوجی، فلسفہ اور نفسیات کے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں) سے مدد لی ہے، اس کے باوجود اس کی تحقیقات پوری طرح علمی نہیں اور انھیں ان بحثوں کا مقدمہ اور خاکہ سمجھنا چاہیے۔

نوٹس کے چھوٹے چھوٹے چوکوروں پر مشتمل اکثر صفحات پر ٹو اور تھری ڈائمنشن منحنیاں کھینچی ہوئی ہیں۔ ساری منحنیاں فکشنل جیومیٹری کی شکل میں ہیں جو پارسا کے خیال میں انسانی مطالب کے درمیان رابطوں کو ریاضی کی زبان میں سمجھاتی ہیں۔ ان منحنیوں کا ایک مجموعہ مختلف مفاہیم جیسے کام کاج، سماجی نفوذ، تعلیم، شہرت اور آمدن سے خوش قسمتی کا رابطہ ظاہر کرتا ہے۔ گرافوں کا ایک اور گروہ ایک آئیڈیل معاشرے کو کمیت اور کیفیت کے حوالے سے جانچنے کی ایک کوشش ہیں۔ کمیت کے حوالے سے تجزیے میں زمین کی وسعت، آبادی، تمام آبادی میں کا نوجوانوں اور عورتوں کا ریشو، کام، غیر خالص قومی پیداوار، سماجی امن و امان اور نظم و ضبط اور کسی بھی

معاشرے کی ترقی کی رفتار میں سیاسی استحکام اور فوجی قوت جیسے پیرامیٹروں کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کیفیت کے حوالے سے ایک پسندیدہ معاشرے میں مختلف مفاہیم میں اقتصاد، ثقافت، آزادی، ٹیکنالوجی، مذہب، آرٹ، حفظانِ صحت، تعلیم اور صنعت جیسے بعض مفاہیم کا ریشو دیکھا گیا ہے۔ نوٹس کا ایک اور حصہ مختلف معاشروں میں بگاڑ پیدا کرنے اور اسے پس ماندگی کا شکار کرنے والے تخریبی عناصر سے بحث کرتا ہے۔ اس حصے کے ساتھ ہی ایک امریکی اسٹیٹ میں چوری، فراڈ، ریپ قتل، کڈنیپنگ اور جعلی ڈاکومنٹس تیار کرنے جیسی سماجی ناہمواریوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ میں نوٹس میز پر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہوں۔ صبح کے دس بج رہے ہیں۔ دروازہ کھولتا ہوں۔ علی رضا ہے۔ گاڑی کی چابی دینے آیا ہے۔ ہم دونوں ڈائننگ روم میں بیٹھتے ہیں تو میں نے اسے پارسا کے نوٹس دکھاتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ نوٹس پڑھے اور اگر اس میں ڈاکٹر پارسا کی خودکشی سے متعلق کچھ نظر آئے تو مجھے بھی بتادے۔

علی رضا نوٹس دیکھ کر مسکراتا ہے اور کہتا ہے: ''تم ابھی تک پارسا کی قبر کی کھدائی میں مصروف ہو؟''

''یہ پارسا ایسا مرا ہوا شخص ہے جو جب تک مجھے قبر میں نہ اتارے، اپنے مرنے کی وجہ نہیں بتانے والا۔ پارسا کے گھر میں ایک کمپیوٹر ہے جس میں ممکن ہے اہم معلومات موجود ہوں۔ آخرکار تم بھی اس پراجیکٹ کے پرخچوں کی زد میں آگئے۔ میری مدد کرو گے؟''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہتا ہے: ''میں تمھاری مدد کروں گا لیکن کبھی کبھی ایسے سوالات بھی موجود ہوتے ہیں جو 'پارسا نے خودکشی کیوں کی؟' سے کہیں زیادہ مشکل ہیں۔ ان سوالات کے جوابات ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔'' اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح طنز اور کنایہ سے لبریز ہے۔

''تم یہاں کسی خاص موضوع پر بات کرنے آئے ہو؟''

اس نے جیسی میری بات سنی ہی نہ ہو، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

''ان چیزوں کو سمجھا نہیں سکتا، ان کا ادراک نہیں کیا جاسکتا یا حتیٰ کہ ان کی وضاحت بھی نہیں کی جاسکتی۔ ان چیزوں کے قریب جایا جاسکتا ہے، انھیں چھوا جاسکتا ہے، حتیٰ کہ ان میں ضم ہوا

جا سکتا ہے لیکن انھیں ذرہ بھر بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہمیشہ اشاروں کنایوں میں بات کرو؟"

وہ کچھ نہیں کہتا۔ ٹشو پیپر کا ڈبہ میز پر بنے ہوئے پھول پر سرکاتا ہے۔ ڈبہ میز کے کنارے تک آ کر رک جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے: "جہاں تک مجھے یاد ہے، سایہ تمھیں تمھاری عقل کی وجہ سے نہیں بلکہ ایمان کی وجہ سے چاہتی تھی۔"

میں ٹشو پیپر کا ڈبہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہتا ہوں: "سایہ نے تمھیں ہماری ناراضی کے بارے میں بتایا ہے؟"

"سایہ نے بتایا کہ تم بہت سی چیزوں کے بارے میں شک کرنے لگے ہو۔ مجھے تمھارے شک کرنے کا خدشہ نہیں کیونکہ شک کرنا ہر انسان کا حق ہے لیکن مجھے کسی اور بات کا خدشہ ہے۔"

"کس بات کا خدشہ؟"

وہ چپ ہو جاتا ہے۔ میں دوبارہ سوال کرتا ہوں: "تمھیں کس بات کا خدشہ ہے؟"

یوں لگ رہا ہے جیسے وہ اپنے ذہن میں صحیح الفاظ ڈھونڈ رہا ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہتا ہے:

"اس بات کا خدشہ ہے کہ اچانک تمھیں اپنے آپ سے مات ہو جائے۔ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ تم اس شئے کے اتنے نزدیک پہنچ جاؤ کہ مزید اسے نہ دیکھ سکو۔ پارسا نے خودکشی کر لی مگر تمھیں ابھی تک اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ اس کا جواب کچھ بھی ہو، ایک چھوٹی حقیقت ہے، لیکن اس سے بڑے حقائق بھی موجود ہیں: کیا حضرت موسیٰ (ع) نے وادی مقدس میں خداوند کا کلام سنا؟ کوئی نہیں جانتا۔ کوئی شخص بھی علمی بنیادوں پر یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ حضرت موسیٰ (ع) نے اس سرد اور ٹھٹھرتی ہوئی رات میں درخت کے اندر سے خدا کی آواز سنی تھا یا نہیں؟ کیا خدا نے کوہِ طور پر تجلی کی؟ کوئی نہیں جانتا۔ پہاڑ پر خداوند کی تجلی کو ثابت یا رد کرنے کے لیے کوئی علمی پیمانہ موجود نہیں ہے۔ کیا خدا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ کوئی ان سوالات کے جوابات کے قریب نہیں جا سکتا جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت ہے۔ تاہم کسی چیز کا نہ جاننا جہاں اسے ثابت نہیں کرتا، اس کی

نفی بھی نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے کہ ہم ان چیزوں پر ایمان رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں اور بس!''

میں چھوٹی سی میز پر پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آن کرتا ہوں۔ علی ٹی وی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھا ہوا ہے:

''میں صرف انھیں چیزوں پر ایمان رکھتا ہوں، جنھیں میں سمجھ سکتا ہوں؛ سمجھنے سے میری مراد تجربہ اور عقل ہے۔''

وہ چابیوں کے گچھے سے منسلک حلقے میں لٹکے ہوئے چھوٹے سے ریچھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا ہے:

''یہ بات ٹھیک ہے۔''

''تم خدا کا تجربہ کرتے ہو؟''

وہ چابیاں میز پر رکھتا ہے:

''میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو نہ صرف خدا کے وجود بلکہ اس کی خصوصیات کو بھی ایک طرح کھیل کھیل میں سمجھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کھیل کھیل سے میری مراد خدا کا تجربہ کرنا ہے۔''

اس کی باتیں سن کر مجھے غصہ آرہا ہے لیکن میں اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

''کیا تم مجھ ملحد کے لیے وضاحت کر سکتے ہو کہ وہ کون سے آلات اور کون سی لیبارٹری ہے، جہاں خدا کا تجربہ کیا جاسکتا ہے؟''

ٹی وی پر ٹیلی سکوپ کی تاریخ سے متعلق ایک ڈاکومینٹری دکھائی جارہی ہے۔ علی بڑے غور سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آہستہ اور دبے دبے لفظوں میں کچھ کہتا ہے، جسے سننے کے لیے مجھے مجبوراً اپنا سر اس کی طرف جھکانا پڑتا ہے۔ وہ غم واندوہ سے بھرے ہوئے لہجے میں کہتا ہے:

''مجھے افسوس ہے! مجھے واقعی اس بات پر سخت افسوس ہے کہ ملحد لوگ خدا کا تجربہ نہیں کر سکتے۔ فطرت کے تجربے کے برعکس، جس کے قوانین تجربے کے بعد اخذ کیے جاتے ہیں، خدا کا

تجربہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم کسی قانون پہ ایمان لے آؤ اور تب جا کر اس کا تجربہ کرو یہاں تک کہ مجھے کہنا چاہیے کہ اس طاقت کے بارے میں تمھارا ایمان جتنا زیادہ مضبوط ہوگا، تجربات کی کامیابی کے احتمالات بھی اسی قدر بڑھ جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں تم خدا پہ جتنا زیادہ ایمان لاتے ہو، تمھارے لیے خدا بھی اسی تناسب سے وجود رکھتا ہے۔ تم خدا پہ جتنا ایمان لاتے ہو، خدا کا حضور اور اس کی موجودگی بھی تمھارے لیے اسی قدر بڑھ جاتی ہے۔"

وہ اپنی مٹھیاں آپس میں ملا کر انھیں زور سے بھینچتا اور چند لمحوں تک خاموش رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جمع ہو گئے ہیں لیکن ٹپک نہیں رہے۔ مجھے اس کی باتیں زیادہ سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ پھر بھی ہمیشہ کی طرح مجھے لگ رہا ہے کہ اس کی باتوں میں ایک خوبصورت ہم آہنگی اور منطق موجود ہے۔ ایک ایسی منطق جس کے لیے لازمی ہے کہ آپ یا تو اس کے تمام بیانات تسلیم کر لیں یا پھر سب کے سب رد کر دیں۔

وہ ایک ٹشو پیپر نکال کر اس سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے:

"اگرچہ خدا کی موجودگی کا تعلق ہمارے ایمان سے نہیں، تاہم اس موجودگی کو محسوس کرنے کا تعلق پوری طرح ہمارے ایمان سے مربوط ہے۔"

علی دوبارہ میز پہ پڑے ٹیشو پیپر کے ڈبے کو گھورنے لگتا ہے اور اس بار اسے پہلے کی نسبت زیادہ زور کا جھٹکا لگاتا ہے۔ ٹیشو پیپر کا کاغذی ڈبہ سرکتا ہوا چابیوں کے گچھے سے لٹکے ہوئے ریچھ کے قریب سے گزرتا اور چائے کی پیالی سے ٹکراتا ہے اور تھوڑا سا مڑ کر نہایت تیزی سے میز کے کنارے تک پہنچ جاتا ہے۔ میں ڈبے کو گرنے سے بچانے کے لیے فوراً اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہوں لیکن ڈبہ نہیں گرتا بلکہ ایک ناپائیدار حالت میں رک جاتا ہے۔ اس کا تھوڑا سا حصہ میز پہ اور باقی حصہ ہوا میں معلق رہ جاتا تھا! میں حیران و پریشان ٹشو پیپر کا ڈبہ دیکھنے میں محو ہو جاتا ہوں۔ میں حیرت، ہیجان، شک و تردید، سوالیہ انداز اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ علی کی طرف دیکھتا ہوں۔ علی نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا ہے اور پوری طرح چپ ہے۔

۱۵

میں گاندی اور جہانِ کودک چوراہے پر ریڈ لائٹ سگنل کے پیچھے گاڑی میں بیٹھا مہرداد کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کچھ دن ہوئے اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ اپنی امی کے لیے امریکہ کا ویزہ لینے میں مصروف ہے۔ فروری کے ابتدائی دن ہیں اور سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ گاڑی کے شیشے سے ٹھنڈی ہوا اندر آرہی ہے۔ آج رات میں، مہرداد اور علی رضا تجریش کے ایک خاموش اور پرسکون رستوران میں کھانا کھانے جارہے ہیں۔ مجھے اگلی صبح کی فلائٹ سے اصفہان جا کر شہرہ بنیادی سے بات کرنا ہے جو اس سمسٹر میں اصفہان چلی گئی ہے۔ اصفہان سے واپس لوٹ کر مجھے مہتاب کرانہ کو ڈھونڈنا ہے۔ میں جلد از جلد پارسا کی فائل بند کر کے اس بدبختی سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ میں اس مسئلے سے تھک گیا ہوں۔ دس سال سے زیادہ عرصے سے میں خانہ بدوشوں کی طرح اس یونیورسٹی سے اُس یونیورسٹی مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اب کلاس، سمسٹر، واحدے اور ان جیسی بکواسیات سے میرا جی متلانے لگا ہے۔ کل صبح علی رضا کو پارسا کا کمپیوٹر چیک کرنے جانا ہے تاکہ ان چند دنوں کے دوران جب مجھے تہران سے باہر جانا ہے، وہ ایک ایک کر کے کمپیوٹر کی تمام فائلیں چیک کرے۔ سگنل ابھی تک ریڈ ہے اور گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں لگی کھڑی ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے سایہ کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ امی اور مونس کے بارے میں بھی پوری طرح لاعلم ہوں۔

پارسا، پارسا، پارسا اور صرف پارسا! پارسا میرا سب کچھ رہ گیا ہے! میری امی، میری بہن، میری بیوی اور میری زندگی، یہاں تک کہ میں خود بھی پارسا میں ڈھل گیا ہوں۔ میں نے پارسا پر لعنت بھیجی اور پھر خود پر لعنت بھیجی جس نے یہ تھیسز چنا تھا۔ اس منحوس تھیسز کی وجہ سے میری ساری زندگی جہنم بن کر رہ گئی ہے۔ مجھے ابھی تک ذرہ بھر پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ ایک چمکیلی اور مہنگی گاڑی میرے پاس آ کر رکتی ہے اور ہارن بجانا شروع کرتی ہے۔ میں اس کے کالے شیشے کے پیچھے ڈرائیور کو دیکھتا ہوں جو میرے لیے ہاتھ ہلا رہا ہے۔ پرویز ہے۔ میرے یونیورسٹی کے دنوں کے ایک ہم جماعت کا بھائی۔ بہت امیر، خوبصورت اور دھوکے باز شخص ہے۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ڈارک گلاسز لگائی ہوئی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ جب وہ گاڑی کا شیشہ نیچے کرتا ہے، تو راک اینڈ رول کی آواز باہر کی طرف لپکنے لگتی ہے۔

وہ کہتا ہے: ''سلام یونس! کہاں غائب ہو بھئی؟''

میں مسکراتے ہوئے گاڑی کا شیشہ نیچے کرتا ہوں۔ پھر سامنے سگنل کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں: ''ریڈ لائٹ کے پیچھے!''

پھر میں اس سے اپنی زندگی کا ایک نہایت بھونڈا سوال پوچھتا ہوں: ''کیا حال چال ہے؟''

اس کی گاڑی سے سینٹ کی تیز خوشبو نکل کر میرے مشام سے ٹکراتی ہے۔ پرویز اپنے ہونٹ سکیڑ کر شرارت بھرے انداز میں ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے: ''بنفشہ کے پھول کی خوشبو سونگھ اور نگار کی زلفوں کو تھام لے۔ لالہ کا رنگ دیکھ اور شراب پینے کا ارادہ کر۔''

یہ کہہ کر زور زور سے ہنسنا شروع کرتا ہے۔ لڑکی بھی اس کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں' پرویز تین جملوں پر مشتمل ہے: ''پرویز نہیں سوچتا، پرویز خوش ہے، پرویز پرسکون ہے۔''

وہ کہتا ہے: ''بس جی رہے ہیں۔ یا لڑکیوں میں، یا پارٹیوں میں، یا کش لگاتے ہوئے یا موج مناتے ہوئے، القصہ موجاں ہی موجاں ہیں۔ یا نمکین کے ساتھ ہیں یا شیرین کے ساتھ۔ جب ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہو تو میں قربان جاؤں ثریا کے!''

سورج کی تیز روشنی میری آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔ گاڑی کی ونڈ شیلڈ کے اوپر کا چھاتا نیچے کرتا ہوں تو میری نظر سایہ کی تصویر پر پڑتی ہے جسے اس کی دوسری طرف چپکایا گیا تھا۔ تصویر میں سایہ ایک گھڑی کے ایک بڑے اشتہاری بینر کے نیچے کھڑی کسی نامعلوم نقطے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ پرویز مسلسل بولے جا رہا ہے:

"ایسی خان نے سیا سے کہا: 'بکواس بند کرو!' وہ بولا: 'حرامزادے! میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔' سیا نے کہا: 'ضرور تمھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ایسی خان!' ایسی نے کہا: 'میں تمھیں جان سے مار دوں گا۔ میں اسے بھی مار دوں گا۔ خدا کی قسم۔ میں تم دونوں کی جان لے لوں گا۔' میں بولا: 'ایسی خان۔ آپ پرسکون رہیں۔' میں نے کہا: 'سیا تم مان جاؤ اور معافی مانگ لو۔ کہہ دو کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ کہہ دو کہ میں آپ کا تعبیدار ہوں۔' ایسی بولا: 'نمک حرام! بے غیرت!' وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ میں نے سیاوش سے کہا: 'شہر میں اتنی ساری لڑکیاں تھیں، تمھیں ان سب کو چھوڑ کر سوسن کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟'"

"یہ سوسن کون ہے؟"

پرویز سڑک کی دوسری طرف کے سگنل کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اب سرخ سے پیلا ہو چکا ہے۔ دیکھ کر کہتا ہے: "ایسی خان کی بہن ہے میری جان۔ میں تیرے قربان۔"

ایسے میں سگنل گرین ہو جاتا ہے اور سرخ چمکیلی کار بھی شمالی علاقہ جات کی طرف تیزی سے بڑھنے والی سیکڑوں گاڑیوں میں کھو جاتی ہے۔ پھر کالی اور چپچپی دلدل سے اچھل کر سامنے آنے والے مینڈک کی طرح کوئی نامعلوم شے میرے ذہن کی سطح پر ابھرنے لگتی ہے اور میں گاندی بجاتا ہوں اور اپنے آس پاس پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی گاڑیوں کے بیچوں بیچ حیران و پریشان سڑک کے دونوں کناروں کو گھورنے لگتا ہوں اور بھیڑ میں اپنی ماں سے بچھڑ جانے والے کسی بچے کی طرح مجھے ایک عجیب خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں اسٹیرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑتا اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں تاکہ وہ نامعلوم شے واضح ہو سکے اور میں خود سے پوچھوں کہ: "کیا کوئی خدا ہے؟"

۱۶

شام ہو چکی ہے۔ اذان کی آواز کھڑکی کے راستے پورے کمرے میں پھیل گئی ہے۔ سایہ بڑی سی سفید پھول دار چادر پہنے جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہی ہے۔ میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ سایہ کی امی میز پر پھلوں سے بھری پلیٹ رکھ کر خود کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں۔ ٹی وی پر فالتو بوٹیاں صاف کرنے کے بارے میں ایک ڈاکومینٹری دکھائی جا رہی ہے۔ سایہ اپنی نماز پڑھتی ہے تو آ کر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ پلیٹ سے ایک سیب اٹھاتی اور چاقو سے اسے چھیلنے لگتی ہے۔

میں کہتا ہوں: ''اللہ تمھاری نماز قبول فرمائے۔''

وہ اپنی ٹوڑھی کے نیچے لگی ہوئی اپنی چادر کی گرہ کھولتی اور کہتی ہے: ''آمین!''

چاقو سے سیب کے چار برابر ٹکڑے کر کے کہتی ہے: ''مجھ سے بچوں کی طرح پیش آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے علی کو فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سچ کہوں تو میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں بہت ڈری ہوئی تھی۔''

میں پوچھتا ہوں: ''اب بھی ڈر لگ رہا ہے؟''

''نہیں۔ اب نہیں ڈرتی۔ علی نے بتایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ

شک کرنا انسان کی زندگی میں ایک اچھا لیکن اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے۔"

میں کانٹا سیب کے ایک ٹکڑے کے سینے میں اتارتا اور کہتا ہوں: "اور اگر میں میں کہوں کہ میں اس اسٹاپ پر ہمیشہ کے لیے اتر چکا ہوں تو؟"

وہ اپنا اسکارف اٹھاتی ہے تو اس کے بال اس کے کندھوں پر بکھر جاتے ہیں۔

"علی کہتا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ شک صرف انسان کا وہم ہوتا ہے۔ خدا موجود ہے اور اس کی موجودگی کا ہم سے، ہمارے شکوک سے یا ہمارے علم سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اس نے کہا کہ شک کی دوسری طرف کچھ ہے نہیں کہ تمھیں اس میں گرنے کا خطرہ ہو۔ علی نے کہا کہ شک کھائی کا وہم ہے۔"

"بہرحال، میں اس دن کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ واقعی معذرت خواہ ہوں۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی اور پھر کہتی ہے: "جو بھی ہو آپ میرے ہونے والے خاوند ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ مرد چاہے جتنے بھی بڑے ہو جائیں، پڑھے لکھے ہو جائیں اور امیر ہو جائیں، ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں۔ جلدی روٹھ جاتے ہیں، جلدی پشیمان ہو جاتے ہیں اور فوراً صلح بھی کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے خواتین کے سامنے کچھ نہ کہیں لیکن تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ کسی نے مردوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ امی کہتی ہیں کہ خواتین لاکھ چھوٹی کیوں نہ ہوں، پھر بھی مائیں ہوتی ہیں اور مردوں کی پناہ گاہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹی بچیاں بھی اپنے باپ کی پناہ گاہ ہوتی ہیں۔ امی نے کہا تھا کہ آپ واپس ضرور آئیں گے۔"

میں صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس جا کر زمین پر دو زانو بیٹھ جاتا ہوں۔ میری نگاہیں اس کے ہاتھوں پر پڑتی ہیں اور ان پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر چند سفید دھبے دکھائی دے رہے ہیں جو شاید زیادہ برتن اور کپڑے دھونے کی وجہ سے ہیں۔ میں کہتا ہوں:

"امی ٹھیک کہتی ہیں۔"

پتہ نہیں مجھے کیا موت آئی ہے۔ میرے دل میں طوفان برپا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے میں اسکول کا ایک لڑکا ہوں جسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آسان سے آسان سوال بھی میرے لیے انتہائی

پیچیدہ معما بن کر رہ گئے ہیں۔ جیسے ساری دنیا میں اندھیرا ہوگیا ہے۔ جیسے میں اندھا ہو چکا ہوں۔ میں اپنا سر سایہ کے گھٹنوں پر اس کی چادر کے درمیان رکھتا ہوں اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہوں۔ جیسے اچانک کئی سال کے روکے ہوئے آنسو سیلاب کی طرح امڈنے لگتے ہیں۔ سایہ کی چادر سے یاسمن کی خوشبو نکل کر میرے پھیپھڑوں میں بھرنے لگتی ہے۔ سایہ اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں سے چھڑاتی اور انھیں میرے بالوں میں پھیرنے لگتی ہے اور ساتھ ہی ایک نظم پڑھنا شروع کرتی ہے جو میرے لیے بہت مانوس ہے:

میں نے کسی کے آنے کا خواب دیکھا ہے
میں نے ایک سرخ ستارے کو خواب میں دیکھا ہے
اور میری آنکھیں پھڑکتی ہیں
اور میرے جوتے سلیقے سے رکھے جاتے ہیں
اور اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے میری بینائی چلی جائے
کوئی آنے والا ہے
کوئی دوسرا، کوئی بہتر
کوئی جو اور کسی سے مشابہ نہیں ہے
اور اس کی طرح ہے جس کی طرح اسے ہونا چاہیے
اور اس کا قد معمار کے گھر کے درختوں سے بھی اونچا ہے
اور چہرہ چاند سے بھی اجلا
اور اس نام وہ ہے
جیسے امی اپنی نماز سے پہلے اور بعد میں پکارتی ہے
یعنی یا قاضی الحاجات
اور وہ تیسری جماعت کے سارے مشکل الفاظ
بند آنکھوں سے بھی پڑھ سکتا ہے

میں نے چھت کی ساری سیڑھیوں پر جھاڑو پھیر دیا ہے
اور کھڑکیوں کے شیشے دھو دیے ہیں
کوئی آئے گا
اور کالی کھانسی کا شربت بانٹے گا
اور ہسپتال کے نمبر بانٹے گا
اور ہمیں ہمارا حصہ دے گا
میں نے خواب دیکھا ہے۔۔۔

سایہ اپنی انگلیاں میرے بالوں سے نکال کر ایک لمحے کے لیے انھیں میری انگلیوں میں پھنساتی ہیں اور پھر اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھتی ہے۔ اس کے بعد میری آنکھوں پر جو جل رہی ہیں اور اچانک نمکین پانی سے بھر جاتی ہیں۔

۱۷

جب میں اور مہر داد رستوران پہنچتے ہیں تو علی رضا وہاں ہمیں کھڑکی کے قریب چار کرسیوں والی ایک میز کے پیچھے بیٹھا ملتا ہے جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی باتیں سن رہا ہے۔ نوجوان جلدی جلدی ہاتھ ہلا کر ہیجانی انداز میں بات کر رہا ہے، جبکہ علی پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا ہے۔ ہم دونوں سلام کرتے ہیں اور اپنی اپنی کرسی پکڑ لیتے ہیں۔ مہر داد ایک گلاس میں پانی انڈیلتا ہے اور میں میز کے پاس کھڑے بیرے سے چار سوپ لانے کو کہتا ہوں۔ مہر داد پانی کا گلاس پی لیتا ہے اور میں کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پارسا کے گھر کا ایڈریس علی کو لکھ دیتا ہوں تاکہ وہ کل کمپیوٹر چیک کرنے پارسا کے گھر جائے۔ ایڈریس لکھنے کے بعد میں بے اختیار علی سے باتیں کرنے والے نوجوان کی باتیں سننے لگتا ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے لیکن ایسی بات کر رہا ہے جن کے بارے میں اس سے پہلے کسی ڈرائیور نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ میں کن انکھیوں سے مہر داد کی طرف دیکھتا ہوں تاکہ اس کے تاثرات جان سکوں۔ وہ بھی میری طرح حیران ہے اور اس لحاظ سے اس کی حالت بھی مجھ سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ علی کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہے لیکن ٹیکسی ڈرائیور کی باتیں سن کر یہ پھیکی مسکراہٹ بھی آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہے

اور اس کی جگہ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں:

''۔۔۔آہستہ آہستہ میرے لیے ساری چیزیں واضح ہو رہی ہیں یہاں تک کہ میں افعال کا وزن بھی محسوس کر رہا ہوں، جو گھپ اندھیرے میں کوہستانی علاقے میں ڈرائیونگ کی طرح ہے۔ تمھیں اپنی نظریں صرف اسی حصے پر رکھنا ہوتی ہے جو گاڑی کے فرنٹ لائٹس کی وجہ سے روشن ہے، یعنی صرف چند میٹر آگے تک۔ دائیں بائیں نہیں دیکھنا چاہیے۔ اسٹیرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑ کر چند میٹر آگے تک دیکھنا چاہیے۔ کسی سے بات چیت نہیں کرنی چاہیے۔ کچھ سننا نہیں چاہیے۔ گاڑی کے کمبخت ریکارڈر کو بھی بند کرنا چاہیے۔ ریڈیو کی بکواسیات کی طرف بھی توجہ نہیں دینی چاہیے۔ پہاڑی کے خانہ خراب دامن میں جو کچھ بھی ہے، اسے بھول جاؤ۔ اس طرح آگے بڑھو تو رفتہ رفتہ خطرناک موڑ ظاہر ہوتے رہیں گے اور تمھیں ان سے کسی قسم کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر تم دوسری چیزوں کے بارے میں سوچو گے تو یقیناً کچھ نہیں کر پاؤ گے یا کھائی میں گر جاؤ گے یا کسی چٹان سے ٹکرا جاؤ گے۔ ٹھیک ہے کہ میں 'کچھ نہیں کر سکا' لیکن کل رات جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا تو عباس آباد میں ایک عورت نے کہا: ''الہیہ؟'' میں نے بریک لگائی۔ جیسے کسی نے مجھ سے کہا ہو کہ 'اس عورت کی مدد کرو' عورت آگے آ کر بیٹھ گئی اور شارع میرداماد تک کچھ نہیں بولی۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا: 'بھاڑ میں جائے ساری دنیا اور دنیا کے لوگ۔' اس نے کہا کہ کاش اس وقت کوئی شخص آ جائے اور اس کا سر کاٹ دے اور اسے اس بدقسمتی سے چھٹکارا دلائے۔ میں نے کچھ نہیں کہا، نہ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں نے اس سے قبل بھی اس طرح کے بہت سے مسافر دیکھے تھے۔ مدرس ہائی پر مڑتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا کہ دو سال پہلے اس کے شوہر نے اس سے کہا تھا کہ وہ سفر پر جا رہا ہے اور پتہ نہیں کب واپس لوٹے گا۔ بولی کہ اس کا شوہر ایک لفنگا آدمی تھا اور اب پچھلے تین سال سے اسے اور اس کے تین بچوں کو اس عظیم جہنم میں اکیلے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بولی کہ مجھے یقین ہے کہ وہ حرامزادہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ یہ باتیں اس لیے کر رہی ہے کہ میں اس سے کرایہ نہ لوں تو مجھے اس سے کوئی کرایہ نہیں چاہیے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں اور خدا کی خوشنودی کے لیے اسے کہیں بھی پہنچا سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں اچھا کام کرنا چاہتا تھا۔ یعنی

اس وقت میں ان باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو تم نے مجھ سے کہی تھیں اور اپنے آپ سے کہا: 'عباس یہی وقت ہے کچھ کر کے دکھانے کا!' اس نے پوچھا: 'تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟' میں نے کہا: 'خدا کی خوشنودی کے لیے۔' اچانک اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس قدر زور زور سے ہنسی کہ اس کا ماتھا گاڑی کے شیشے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں نے کہا' مجھے نہیں لگتا یہ کوئی لطیفہ تھا۔ وہ بولی: 'اتفاق سے۔ بہت مزاحیہ بات تھی، واقعی بہت مزاحیہ بات تھی۔' اس نے کہا: 'کیا ہوا اگر تم اپنے اس خدا سے کہو کہ اپنے آسمان سے اس بدبخت عورت کے لیے چند بڑے نوٹ پھینکے؟' یہ کہہ کر ایک بار پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا: 'اے نوجوان شخص! میرا اور میرے تین کتے کے پلوں کا مسئلہ کرایے کے دو چار پیسوں سے حل نہیں ہونے والا!' پھر اس نے اپنی چادر کندھوں پر ڈال کر کہا: 'اچھا بتاؤ تو آج کی رات موج مستی منانے کا ارادہ نہیں ہے تمھارا؟ اس طرح تم بھی موج کرو گے اور مجھے بھی کچھ پیسے مل جائیں گے۔ میرا خیال ہے اس طرح تمھارا خدا بھی پوری طرح خوشنود ہوگا۔ منظور ہے؟' میں نے گلی میں مڑتے ہوئے کہا: 'کیا تم نے کبھی خدا کے بارے میں کچھ سنا ہے؟' اس نے اپنے پرس سے ایک چھوٹا سا آئینہ باہر نکالا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر بولی: 'ہاں کچھ سنا تو ہے لیکن اس سے کبھی مجھے کوئی نفع نہیں پہنچا۔ لیکن اس بندر نے یقیناً کچھ نہیں سنا ہوگا۔ اپنے شوہر کی بابت کہہ رہی ہوں۔ میں بہت سے لوگوں کو جانتی ہوں جنھوں نے خدا کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا۔ میرا خیال ہے کہ خدا کو بھی میرے بارے میں زیادہ پتہ نہیں ہوگا۔' پھر گاڑی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا: 'اگر اس نے سنا ہوتا تو یقیناً مجھے اس کمینے کے گھونسوں اور لاتوں میں یوں نہ چھوڑا ہوتا۔ اگر سنا ہوتا تو مجھے روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے ہر رات ایک اور بستر پر سونے کی ضرورت نہ پڑتی۔' پھر اس کا جی بھر آیا اور کہا: 'اگر اس نے میری سنی ہوتی تو مجھے ہر روز اپنے بچوں سے یہ کہنا نہ پڑتا کہ میں شاپنگ کرنے جا رہی ہوں۔' میں نے گاڑی ایک طرف پارک کی، جیب میں ہاتھ ڈالا اور تب تک جو بھی کمایا تھا، سب نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا، یہاں تک کہ چھٹے بھی۔ پھر کہا: 'تم سمجھو یہ وہ پیسے ہیں جو میرے خدا نے آسمان سے نیچے پھینکے ہیں۔' اس نے کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر سارے پیسے اچک لیے۔ جب گاڑی سے اتری تو میری آنکھوں میں گھورنے لگی۔ اس

کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ گاڑی کا دروازہ بند کرنے سے پہلے بولی: 'میری طرف سے خدا کا چاند سا چہرہ چوم لو!' وہاں سے چند سڑکیں دور ہونے کے بعد مجھے لگا کہ میری حالت غیر ہونے لگی ہے۔ اس بات کا لینا دینا اس عورت سے نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے آس پاس کوئی مرنے والا ہے اور مجھ سے مدد مانگ رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ کوئی نہیں مر رہا لیکن مجھے یہ احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اب مجھے اس کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ آواز جیسے کسی کنویں کی تہہ سے یا پھر کسی گھپ اندھیرے سے آ رہی تھی اور کسی مکھی یا جھینگر کی لگ رہی تھی۔ جب میں اس آواز کے شور سے بہت زیادہ تنگ آ گیا تو میں نے گاڑی کنارے لگائی اور نیچے اتر گیا۔ سڑک پر روشنی زیادہ نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آواز فٹ پاتھ کے ایک کونے سے آ رہی ہے۔ میں فٹ پاتھ کے اس کونے کی طرف بڑھنے اور کان لگا کر سننے لگا۔ میں نے دیوار کے ساتھ ٹہلنا اور اس طرح زمین کو دیکھنا شروع کیا جیسے کسی کے پیسے گر گئے ہوں اور وہ اپنے پیسے ڈھونڈ رہا ہو۔ کچھ دور مجھے دیوار میں ایک چھوٹا سا بل نظر آیا۔ آواز جیسے اسی بل سے آ رہی تھی۔ میں نے گھٹنوں پر جھک کر بل کے اندر جھانکا۔ وہاں مجھے ایک لال بیگ دکھائی پیٹھ کے بل گرا دکھائی تھا جو لاکھ کوشش کرنے پر بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کے منہ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا جسے اس نے زور سے دبا رکھا تھا۔ میں نے بل میں ہاتھ ڈالا اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ لال بیگ فوراً بل سے نکلا اور کچھ دور ایک اور سوراخ میں گھس گیا جہاں چند چھوٹے چھوٹے لال بیگ سوراخ کے دہانے کے قریب پہلے سے موجود تھے، جیسے اپنی ماں کے منتظر ہوں۔"

یہ کہہ کر اس کا دل بھر آتا ہے اور وہ کرسی سے اٹھ کر ریستوراں سے باہر جانے لگتا ہے۔ میں اور مہرداد علی کی طرف دیکھنے لگے۔ علی نے جیسے ابھی ابھی مہرداد کو دیکھا ہو، اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور اسے مضبوطی سے گلے لگا لیتا ہے۔ دونوں ایک منٹ تک ایک دوسرے کو آغوش میں بھینچے رہتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔ پھر علی طنزیہ انداز میں مہرداد کے کان میں کہتا ہے: I Love You۔

بیرا سوپ لے آتا ہے تو علی نے ایک سوپ واپس لے جانے کو کہتا ہے۔ میں علی سے پوچھتا ہوں: "کون تھا یہ بندہ؟"

وہ مسکرا کر کہتا ہے: ''یہ شخص لال بیگوں کی دعاؤں کی آواز تک کو سن سکتا ہے!''

اس بات سے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ٹیکسی ڈرائیور کے بارے میں زیادہ تفصیلی بات نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بات میرے لیے بھی اہم نہیں ہے۔ واقعی نہیں ہے۔ مہرداد نے اپنے سوپ میں مرچ ڈال کر کہتا ہے: ''واقعی ہماری کائنات بڑی پیچیدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ زندگی گزارنے کے فارمولے روئے زمین پر موجود تمام انسانوں کے برابر ہیں، یعنی تقریباً چھ بلین فارمولے!''

میں ایک چمچ سوپ پی کر علی سے پوچھتا ہوں: ''تم واقعی اس بندے کی باتوں کو سچ مانتے ہو؟''

وہ رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہتا ہے: ''تم پھر شروع ہو گئے؟''

میں کہتا ہوں: ''سچ میں۔ کیا تمھیں واقعی لگتا ہے کہ اس بندے نے لال بیگوں کی آواز سنی تھی؟''

وہ کہتا ہے: ''اس بات پر یقین کرنا یا نہ کرنا کہ اس نے لال بیگ کی آواز سنی ہے یا نہیں، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسے لگتا ہے کہ اس نے سنی ہے۔ پس بظاہر خود اس کے علاوہ ایسا کوئی دوسرا بندہ نہیں جو اس بات کی تائید یا نفی کر سکتا ہو۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم اپنا سوپ پیو اور بس!''

علی کو کسی بھی سوال کے جواب دینے سے جان چھڑانے کا طریقہ اچھی طرح آتا ہے۔ وہ مہرداد سے کہتا ہے: ''ایران میں خوش آمدید!''

مہرداد اپنا سوپ ایک طرف رکھ کر کہتا ہے: ''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مستقبل میں اس طرح ہم تینوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے، لیکن مستقبل کی کس کو خبر ہے؟ یہ بھی دنیا کے پیچیدہ ہونے کی ایک اور دلیل ہے!''

علی اس کی طرف دیکھ کر کہتا ہے: ''تم واقعی سمجھتے ہو کہ دنیا پیچیدہ ہے؟''

مہرداد اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا: ''سچ بتاؤں تو میں آج بھی ہائی اسکول کے برسوں کی طرح انھیں مہلک سوالوں کا شکار ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کہاں سے شروعات کرنی چاہیے؟ مطلب میں یہ بات اب تک ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا

نہیں؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں؟ شاید یہی وجہ ہے کہ جب بھی میری زندگی میں کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو میں اپنے آپ کو قانع نہیں کر پاتا اور حالات پر قابو نہیں پا سکتا۔"

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ مہرداد نے بھی زبان کھولی ہے۔ جولیا کے مسئلے نے اسے بری طرح الجھا دیا ہے اور شاید اس بوجھ کو سہارنے کا بہترین طریقہ باتوں کے ذریعے اپنا من ہلکا کرنا ہے۔ میں واقعی اس کے لیے سخت پریشان ہوں۔ کل رات جب میں ٹیلیفون پر علی سے آج رات کے کھانے کا وقت مقرر کر رہا تھا، میں نے جولیا کی حالت کے بارے میں بھی اس سے تفصیلی بات کی۔ میں نے علی سے کہا تھا کہ وہ جیسے چاہے مہرداد کی دلجوئی کرے۔

علی کہتا ہے: "میں مانتا ہوں کہ پہلی نظر میں دنیا بہت پیچیدہ دکھائی دیتی ہے لیکن میرا نہیں خیال کہ اس معمے کو حل کرنا زیادہ مشکل ہوگا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ کام کافی حد تک بہت آسان ہے۔"

میں اپنا چمچہ پلیٹ میں رکھ کر کنایتاً پوچھتا ہوں: "آسان ہے سے تمھاری کیا مراد ہے؟ کیا تم یہ 'آسان ہونا' مجھے اور مہرداد کو بھی سکھا سکتے ہو تاکہ ہمیں بھی اس جہنم سے چھٹکارا مل جائے؟"

علی اپنا گلاس بھرتا ہے اور کچھ دیر چپ ہو جاتا ہے۔ پھر بولتا ہے: "کائنات کی کئی پرتیں ہیں۔ بھول بھلیوں کی طرح۔ رازوں سے بھری ہوئی اور یقیناً پیچیدہ۔ اسے سمجھنے کے لیے اچھا ہونا ضروری ہے۔ بس یہی۔ اس مشکل سوال کے لیے میرا جواب یہی ہے؛ اچھا۔ میرا خیال ہے کہ ہر انسان کو ہر حالت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سب سے بہترین قدم کیا ہے۔ سارا مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان اس 'بہترین قدم' کا انتخاب نہیں کرتا۔ اس صورت میں اس نے کسی حد تک راستہ کھو دیا ہے۔ اگر اگلے مرحلے میں بھی وہ اچھائی کے آگے سر تسلیم خم نہ کرے تو راستہ اور گھمبیر اور تاریک ہو جاتا ہے۔ جب ہم ایک ہزار اچھے آپشنز کی جگہ ایک ہزار برے آپشنز چنتے ہیں تو حالات اتنے گھمبیر اور آشفتہ ہو جاتے ہیں کہ آدمی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ گویا دھند میں چل رہا ہو جہاں ہر قدم کے ساتھ راستہ صاف ہوتا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے کائنات اتنی سخی ہے کہ ہر بار آپ کو ایک اور موقع فراہم کرتی ہے تاکہ آپ سب کچھ نئے سرے سے شروع کر سکیں۔ تاہم اگر آپ کسی صورتحال

میں اچھے قدم کا انتخاب کریں تو راستہ کسی حد تک روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔ اگلے مرحلے میں صورتحال زیادہ پیچیدہ ہونے کا احتمال ہے جہاں پہنچ کر ایک بار پھر آپ کو انتخاب کرنا ہوگا۔ یہ بار بار انتخاب بھول بھلیوں کی طرح ہمیشہ آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔ ہر بار انتخاب کے ساتھ آپ کی سپیڈ بڑھتی رہتی ہے۔ ہر اچھا اور صحیح انتخاب آپ کی سپیڈ بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ آپ روشنی کی سپیڈ سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہر برا انتخاب آپ کی سپیڈ گھٹاتا ہے۔ جو لوگ ہمیشہ برے انتخاب کرتے ہیں، ان کی حالت افسوس ناک ہو جاتی ہے۔ ان کی رفتار اتنی کم ہو جاتی ہے کہ پوری طرح رک جاتے ہیں اور پھر اندر دھنسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر دھنستے ہی چلے جاتے ہیں' یہاں تک کہ پوری طرح زندہ در گور ہو جاتے ہیں۔ یقیناً ایسے افراد کے لیے بھی نئے مواقع فراہم ہیں، لیکن یہ لوگ زمین کی تہہ سے سطح پر آنے کے لیے کافی وقت لیتے ہیں۔ زندگی انسانوں کے لیے اس طرح کے انتخابات سے بھرا ہوا ابدی آمنا سامنا ہے۔"

مہرداد اپنی انگلیاں آپس میں ملاتا ہے اور علی کی باتوں میں مگن ہے۔ علی رضا اپنی باتیں جاری رکھتا ہے:

"خوش قسمتی سے اچھائی کا انتخاب بہت آسان ہوتا ہے، ہر چند اسے انجام دینا اتنا ہی آسان نہیں ہے۔ انسان ہر اچھے اور سادہ اقدام کے ساتھ ایک قدم پیچیدہ اور پختہ ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ یہی سادہ اور واضح برتاؤ، جن کا اندازہ ہر کوئی آسانی سے لگا سکتا ہے، ان اینٹوں کی طرح ہیں جو آخر کار ایک بڑی اور پیچیدہ عمارت تعمیر کرتی ہیں۔ یہاں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ جب تک نیچے کی قطاریں ٹھیک نہ ہوں، اوپری قطاروں کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص ہر طرح کی صورتحال میں اتنا ضرور جانتا ہے کہ جو وہ کر رہا ہے، ٹھیک ہے یا غلط۔ جو اچھے کاموں میں مضبوط ہو جائے، رفتہ رفتہ اچھائیوں کا وزن بھی محسوس کرنے لگتا ہے؛ یعنی چند اچھی چیزوں میں سے بہترین چیز کی پہچان' کر سکتا ہے۔ جو کوئی صرف اچھی چیزیں انجام دیتا ہے، رفتہ رفتہ کائنات کے مرکز میں بدل جاتا ہے۔ مرکز سے میری مراد یہ ہے کہ وہ جہاں بھی کھڑا ہو، کائنات کو اپنی دسترس میں رکھ سکتا ہے۔ ایسا کوئی شخص اگر چاہے تو لال بیگوں کی آواز ہی نہیں، ان کے خیالات بھی پرکھ سکتا ہے۔ ایسا

انسان بڑی سطح پر پہنچ کر سورج کو غروب ہونے سے روک سکتا ہے یا پھر چاند کو دو ٹکڑوں میں تقسیم سکتا ہے۔ ہر چند ایسی قوت پہ فخر کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ ایسے افراد کے لیے یہ نہایت معمولی باتیں ہیں۔ ایسے لوگ کسی بیمار شخص کو دنیا کے دوسرے کونے میں شفا دے سکتے ہیں۔ ان روابط کی منطق یہ ہے کہ ایسے افراد کو 'بے انتہا' پر عبور حاصل ہوتا ہے اور اس 'بے انتہا' کے لیے ایسے کام کرنا بہت معمولی بات ہے۔''

علی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میز کے کنارے کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اس کا چہرہ لال ہو رہا ہے۔ اس نے میز کو یوں مضبوطی سے پکڑا ہے جیسے کوئی آندھی میز اڑا کر لے جانا چاہتی ہے لیکن اس نے اسے تھام رکھا ہے۔

''بہرحال لوگ مختلف برتاؤ کے مجموعے کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر انسان کا معنوی وزن، اس کے مختلف برتاؤ کے مجموعی وزن کے برابر ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر انتخاب ایک ایسی لکیر کے مانند ہے جو ہم اپنی زندگی کے کورے کاغذ پر کھینچتے ہیں۔ بہت سے لوگ جن کے انتخاب درست نہیں، زندگی بھر آڑھی ترچھی اور نامفہوم لکیروں کا ایک مجموعہ کھینچتے ہیں جن کا کوئی خاص اور واضح مطلب نہیں۔ لیکن جن لوگوں کا انتخاب صحیح ہے، ان کے برتاؤ متوازن اور بامعنی لکیریں وجود میں لاتے ہیں جو بالکل ایک پینٹنگ کی طرح ہوتے ہیں۔''

رات کا کھانا کھانے کے دوران ہم میں سے کوئی ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتا۔ رات کے کھانے کے بعد مہرداد سگریٹ سلگاتا اور پھر علی سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جو اس 'بے نہایت' سے متصل ہو اور دنیا کے دوسرے کنارے یعنی امریکہ کے شہر فلوریڈا میں ایک بیمار عورت کو شفا دینے کی حامی بھرے؟''

علی ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھتا ہے اور میں اثبات میں سر ہلاتا ہوں۔ وہ کہتا ہے: ''جانتا ہوں۔'' پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہتا ہے: ''لیکن صرف اس کا مان جانا کافی نہیں۔ ایسے موقعوں پر آپ کا ایسی 'بے نہایت' اور ایسی 'توانائی' پر مکمل یقین لازمی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لیے خدا اسی قدر وجود رکھتا ہے، جس قدر وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ ایک دوطرفہ رابطہ ہے۔ بعض لوگوں کا خدا اپنے مومن کے لیے ایک معمولی نوکری کا بندوبست بھی نہیں کرسکتا، یا

معمولی نزلہ زکام کو بھی ٹھیک نہیں کرسکتا، چونکہ ایسے خدا پر ایمان رکھنے والا مومن اس سے صرف اسی قدر توقع رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ (ع) سے جھگڑنے والے اس چرواہے کا خدا یقیناً حضرت موسیٰ (ع) اور حضرت ابراہیم (ع) کے خدا سے مختلف تھا۔ اور اس حضرت ابراہیم (ع) کا خدا جو اس پر شدید ایمان کی وجہ سے آگ کے درمیان جاتے ہیں یا پھر اپنے بیٹے کی گردن پر چھری پھیرتے ہیں، یقیناً اس چرواہے کے خدا سے بڑا اور زیادہ مضبوط ہے۔ لیکن یہ خدا بھی پیغمبر اسلام (ص) کے خدا کے سامنے بہت چھوٹا ہے۔ حضرت ابراہیم (ع) اگر اپنے ایمان کی تکمیل کے لیے روئے زمین پر قیامت برپا ہونے کے محتاج تھے یا پھر موسیٰ (ع) طور پر خدا کے جلوہ گر ہونے کے محتاج تھے، پیغمبر اسلام ﷺ کو ایک لمحے کے لیے اپنے خدا کی قدرت اور قوت پر شک نہیں ہوا اور ہمیشہ کہتے تھے کہ اگر ان کی آنکھوں کے آگے سے سارے پردے ہٹا دیے جائیں تو بھی ان کے ایمان میں ذرہ بھر فرق نہیں پڑنے والا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا خدا یقیناً سب سے بڑا خدا ہے۔ اگر ہم لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کے خدا کے بندے بن جائیں تو یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن افسوس جو بندہ خدا پر ایمان نہیں رکھتا، اس کے لیے خدا وجود ہی نہیں رکھتا۔"

مہرداد اپنی سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتا ہے اور پھر پیپسی کی خالی بوتل آگے کھینچ کر اپنے منہ میں بھرا دھواں خواہ مخواہ اس شیشے میں پھونک ڈالتا ہے۔ بوتل میں سگریٹ کا دھواں گھومتے گھامتے اس کی تہہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ علی رستوران کے انتہائی سرے میں موجود چند میز کرسیوں کو گھور رہا ہے۔ بیرا خالی برتن اٹھانے ہماری میز کی طرف بڑھتا ہے۔ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مہرداد اپنی سگریٹیں اپنی شرٹ کی جیب میں رکھتا ہے۔ میں کولڈ ڈرنک کی بوتل کو گھور رہا ہوں جس سے اندر کا دھواں آہستہ آہستہ نکل رہا ہے۔ علی نے ابھی تک میز کا کنارہ زور سے پکڑ رکھا ہے اور اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا۔ بیرا خالی پلیٹیں میز سے اٹھا کر انھیں سلیقے سے ٹرے میں رکھ رہا ہے۔ پھر ایک ایک کر کے کولڈ ڈرنک کی تمام بوتلیں اٹھاتا ہے، جیسے ہی اس کا ہاتھ دھوئیں سے بھری بوتل کی طرف بڑھتا ہے، اچانک غیرارادی طور پر اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے بوتل ٹرے پر رکھ دیتا ہے۔

۱۸

اگلے دن ایئر پورٹ سے میں پارسا کی امی کو فون کر کے کہتا ہوں کہ آج میرا ایک دوست ڈاکٹر پارسا کے کمپیوٹر سے معلومات نکالنے کے لیے ان کے گھر آ رہا ہے۔ اس کے بعد سایہ کو فون کر کے اس سے کہتا ہوں کہ جب میں اصفہان سے واپس لوٹوں گا تو دونوں ایک شاعرانہ ڈنر پر چلیں گے۔ وہ پوچھتی ہے کہ کیا میں نے علی سے اس کے سوال کے بارے میں پوچھا؟ اس کا مطلب حضرت موسیٰ (ع)، جوتے، وادی مقدس وغیرہ سے ہے۔ ایئر پورٹ ویٹنگ ہال کے آخری سرے پر لگے بڑے اسکرین پر دھلائی کا سامان بنانے والی ایک کمپنی کا اشتہار چل رہا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھ کر کہتا ہوں: ''بالکل، علی نے کہا کہ اس نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ جوتوں سے مراد خاص معنی میں حضرت موسیٰ (ع) کی اپنی بیوی سے اور عام معنی میں زمینی عشق سے دور ہونا ہے۔'' مجھے لگتا ہے کہ میرے جواب سے سایہ کی تشفی ہوگئی ہے۔ تاہم میرے لیے اس موضوع کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں ہال کے ایک چپ چاپ کونے میں جا کر اپنے بیگ سے پارسا کی روزانہ یادداشتوں پر مشتمل کاپی نکالتا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہوں۔

''ہفتہ، 2 جنوری 1993ء

آج میں نے ''انسانی مفاہیم کا ریاضیاتی تجزیہ'' کی کتاب کا چوتھا باب مکمل کر لیا۔ اگر میں

نے اسی سپیڈ سے کام کیا تو شاید اگلے آٹھ مہینوں تک پوری کتاب ختم ہو جائے گی۔اس کتاب میں میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ فزکس کی کمیتوں کی طرح انسانی مفاہیم کو بھی ناپا جاسکتا ہے اور بامعنی کیا جاسکتا ہے۔دراصل اس کتاب میں میری کوشش ہوگی کہ میں فلسفہ، سائنس اور آرٹس کے درمیان ایک ربط قائم کروں بلکہ انھیں ایک دوسرے میں ضم کردوں۔"

"بدھ، 4 جنوری 1993ء

میں اس سمسٹر میں اپنے کام سے راضی ہوں۔میرے سارے شاگرد بہت اچھے ہیں۔ خاص طور پر کوانٹم کی کلاس میں، جس میں سارے شاگرد نیوفزکس پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"

یادداشتوں کی تاریخوں کا درمیانی فاصلہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگتا ہے۔

"جمعرات، اکیس جنوری

چھٹیوں پر چھٹیاں! سمسٹر ختم ہونے کی چھٹیاں، سمسٹر شروع ہونے کی چھٹیاں۔چھٹیوں پر چھٹیاں۔فالتو چھٹیاں! آج کل مجھ میں اپنی کتاب پر کام کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔شاید کتاب میری بتائی ہوئی تاریخ تک مکمل نہ ہو۔"

لاؤڈ اسپیکر سے اناؤنس کی آواز آتی ہے: "اصفہان کے مسافر، ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لیے گیٹ نمبر چار پر پہنچ جائیں۔"

یونیورسٹی کے ایجوکیشن آفس کی مدد سے شہرہ بنیادی کو ڈھونڈنے میں مجھے چند گھنٹے لگ جاتے ہیں۔جس کوریڈور میں اس کی کلاس واقع ہے، تب تک ٹہلتا رہتا ہوں جب تک اس کی کلاس ختم نہیں ہو جاتی۔جب اس کی کلاس کی چھٹی ہو جاتی ہے تو میں اس کی ایک ہم جماعت سے اس کے بارے میں پوچھتا ہوں اور وہ ایک دبلی پتلی اور لڑکی کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے اور جو کلاس کے کونے میں چند دیگر لڑکیوں سے بات چیت کر رہی ہے۔جب وہ اکیلی ہو جاتی ہے تو میں آگے بڑھتا ہوں:

"خانم بنیادی؟"

"آپ کون؟"

''میرا نام یونس فردوس ہے۔ دراصل میں اپنا تھیسز مکمل کرنے کے لیے تہران سے آیا ہوں۔آپ سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

پہلے تو اسے تھوڑی حیرت ہوتی ہے اور پھر پوچھتی ہے: ''مجھ سے پوچھنا چاہتے ہیں؟ کیسے سوالات؟''

''میری تحقیق ڈاکٹر محسن پارسا کے بارے میں ہے۔''

وہ پارسا کا نام سن کر پریشان ہو جاتی ہے۔اپنے ہاتھ میں موجود کتاب، بیگ میں رکھ کر جانے لگتی ہے:

''معذرت خواہ ہوں! مجھے گھر جانا ہے۔آج میں ذرا جلدی میں ہوں۔''

''پلیز! صرف چند منٹ۔میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔بس چند سوال۔''

''دیکھیے جناب، مجھے اس بارے میں کچھ نہیں کہنا۔''

باہر سے یونیورسٹی طالبات شور کر رہی ہیں۔کلاس میں میرے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔

''یقیناً، یقیناً۔جیسا آپ کہیں۔تاہم میں نہ تو ٹی وی رپورٹر ہوں اور نہ عدالت کا تفتیشی۔میں بھی آپ ہی کی طرح یونیورسٹی کا ایک طالب علم ہوں اور اپنی پی ایچ ڈی تھیسز پر کام کر رہا ہوں اور بس۔''

''میں نے کہہ دیا ناں کہ میں مجھے اس بارے میں کچھ نہیں کہنا۔''

''یقیناً میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ وہ کام کریں جو آپ کو پسند نہیں ہے، مگر آپ یقیناً میری حالت بھی سمجھ رہی ہیں۔میں بھی آپ کی طرح یونیورسٹی کا ایک طالب علم ہوں اور اگر سچ بتاؤں تو مجھے میں شدید پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں نے اپنے تھیسز کے لیے اس منحوس فائل کا سوشیالوجی کی رو سے تجزیہ ہی بطور موضوع کیوں چنا۔لیکن اب میرے پاس موضوع بدلنے کا وقت باقی نہیں بچا۔دراصل میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔''

مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میں ایک ایسے شخص کے سامنے گڑگڑا رہا ہوں جس سے میں زندگی میں پہلی بار مل ہوں اور وہ بھی ایک ایسے موضوع کے لیے جو ذاتی طور میرے لیے بالکل بھی کوئی

اہمیت نہیں رکھتی۔ اس صورتحال سے میرا جی متلانے لگا ہے۔ شہرہ بنیادی کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے۔ آسمان کالے بادلوں سے بھر چکا ہے جنہوں نے شام سے پہلے ہی ہر طرف اندھیرا پھیلا دیا ہے۔

''عدالتی حکام کی طرف سے ڈاکٹر پارسا کے بارے میں پہلے ہی کافی تحقیقات ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عدالت میں اس کی تشکیل دی ہوئی فائل کا مطالعہ کافی حد تک آپ کی مدد کر سکتا ہے۔''

''میں نے وہ فائل پڑھی ہے لیکن مجھے اس میں کوئی اہم بات دکھائی نہیں دی۔ میں اس خودکشی کے پیچھے کارفرما سماجی محرکات کی کھوج میں ہوں۔''

وہ کلاس کی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور کہتی ہے: ''مجھے لگا تھا کہ تہران سے یہاں آ کر مجھے اس پیچ مسئلے سے چھٹکارا مل جائے گا، لیکن۔۔۔''

وہ خاموش ہو جاتی ہے اور اسکارف کے نیچے اپنی کنپٹیاں اپنے ہاتھوں کے بیچ دبانے لگتی ہے۔

''لیکن کیا خانم بنیادی؟ میری ڈاکٹر کی تمام شاگردوں سے بات ہوئی ہے۔۔۔''

میری بات کاٹ کر کہتی ہے: ''سب سے؟ یہاں تک کہ مہتاب کرانہ سے بھی؟''

''خانم کرانہ سے نہیں، لیکن باقیوں سے بات کر چکا ہوں۔ خانم کرانہ چھٹی پر ہیں، لیکن میں تہران پہنچتے ہی ان سے بھی بات کر لوں گا۔ کیا خانم کرانہ کو اس بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

میں جیسے یہ کہتا ہوں، وہ اچانک رونا شروع کر دیتی ہے۔ میں گھبرا جاتا ہوں اور کہتا ہوں: ''میں معذرت خواہ ہوں۔ میرا مقصد آپ کو تکلیف پہنچانا ہرگز نہیں تھا۔ واقعی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

وہ اپنے آنسو پونچھتی ہے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے:

''یہ سب میرا قصور ہے۔ مجھے اس کام میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ آج سے دو سال پہلے مہتاب اپنے امی ابو کے ساتھ امریکہ سے ایران آئے تھے۔ اس کی امی اٹلانٹا میں دانتوں کی ڈاکٹر ہیں اور ابو قالین وغیرہ ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ ہم دونوں کا سلیکشن شعبہ فزکس میں ہوا تھا۔ میں مہتاب کی واحد سہیلی تھی۔''

''اب نہیں ہیں کیا؟''

''ہوں لیکن۔۔۔''

وہ دوبارہ رونا شروع کر دیتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں: ''یہاں سے باہر جانا چاہیں گی آپ؟''

''ہاں!''

ہم خواہ مخواہ سڑکوں پر ٹہلنے لگتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: ''میں کل ڈاکٹر پارسا کے گھر چلا گیا تھا اور اس کی روزانہ یادداشتوں کی کاپی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تم دیکھنا چاہو گی اسے؟''

''نہیں۔ میں نہیں دیکھ پاؤں گی۔''

''مہتاب کے بارے میں کچھ نہیں کہو گی؟''

''نہیں۔ ابھی نہیں۔''

ٹھنڈ زیادہ ہوگئی ہے اور کبھی کبھار افق میں گرج چمک ہوتی ہے اور تھوڑی دیر بعد پورے شہر میں ایک دھماکے کی سی آواز پھیل جاتی ہے۔ میں اپنے اوورکوٹ کا کالر اوپر اٹھاتے ہوئے کہتا ہوں:

''ڈاکٹر پارسا آخری بار کلاس میں آیا، میرا مطلب ہے بدھ نو اکتوبر کو، کیا تم نے اس کے برتاؤ میں کسی قسم کا خاص بدلاؤ نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔ ڈاکٹر پارسا ایک متین اور باوقار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کبھی اپنے دل کی بات زبان پر نہ لاتا تھا۔''

شہرہ بنیادی اچانک فٹ پاتھ پر جلتے بجھتے سائن بورڈ کے نیچے رک کر کہتی ہے:

''ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر پارسا عاشق ہوا۔ مہتاب پر۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ بات مہتاب کو کیسے بتائے۔ مہتاب بھی بہت روکھی اور منطقی ذہنیت کی مالک تھی۔ ایک بار جب ڈاکٹر نے ٹیسٹ لیا تھا اور مہتاب کے نمبر کلاس میں سب سے زیادہ آئے تھے، پارسا نے اس کے پیپر کے نیچے لکھا تھا: 'مجھے خوشی ہے۔ بہت زیادہ۔' پہلے پہل ڈاکٹر پارسا جتنی زیادہ توجہ دکھاتا تھا، مہتاب اسی قدر بے اعتنائی کا اظہار کرتی تھی۔ میرے خیال میں مہتاب میں جذبات اور احساسات سرے سے تھے ہی

نہیں، یا اگر تھے بھی تو حد سے زیادہ کم تھے۔ لیکن اس کے بعد مہتاب بھی پارسا پر فریفتہ ہوگئی۔"

ہم چار باغ کی سڑک پار کرنے لگتے ہیں۔ سڑک کے بیچوں بیچ پہنچ کر میں پوچھتا ہوں:

"کیا وہ ایک دوسرے سے اکیلے میں بھی ملتے تھے؟"

"ہاں، ایک بار۔ وہ بھی میرے کہنے پر۔ اسی لیے میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتی ہوں۔

ڈاکٹر پارسا نے مہتاب سے کہا تھا کہ اسے لگتا ہے کہ وہ اسے چاہنے لگا ہے۔ پارسا نے کہا تھا کہ یہ احساس اس کے لیے زندگی میں نیا ہے۔ اس نے مہتاب سے کہا تھا کہ ہر چند یہ زندگی میں پہلی بار ہوا ہے کہ وہ کسی کو اس قدر زیادہ چاہنے لگا ہے، تاہم اس کا خیال ہے کہ اس کے احساس کا تعلق عشق اور اس جیسی دوسری بکواسیات سے نہیں ہے۔ سچ کہوں تو مجھے پارسا کی باتیں زیادہ سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کسی کو چاہیں لیکن اس پر عاشق نہ ہوں۔ مثلاً پارسا نے مہتاب سے کہا تھا کہ اسے مہتاب کی آواز سننا پسند ہے۔ اس نے کہا تھا کہ جب مہتاب بات کرتی ہے تو وہ صرف اور صرف اس کی آواز سنتا ہے، اس کی باتیں نہیں۔ کہتا تھا کہ وہ گھنٹوں مہتاب کی آواز سن سکتا ہے اور اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مہتاب کی آواز کن الفاظ پر مشتمل ہے۔ وہ کہتا تھا کہ حتیٰ اسے یہ بھی منظور ہے کہ مہتاب ہزاروں بار اس سے کہے: 'چلو دفع ہو جاؤ' تاکہ وہ ہر ہزار مرتبہ "چ"، "د" اور "ؤ" کو نہایت لطف اندوز ہو کر اس کی آواز کی موسیقی کے ساتھ سن سکے۔ میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ مہتاب سے پارسا کا عشق بہت عجیب تھا۔ مثال کے طور پر ایک دن مہتاب نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر نے ٹیلیفون پر اس سے کہا ہے کہ وہ اس کے ہاتھ چھونے کے بجائے گھنٹوں تک انھیں گھورتے رہنا چاہتا ہے۔ اس نے مہتاب سے کہا تھا کہ اسے مہتاب کی روح سے سخت محبت ہوگئی ہے۔ اس سے کہا تھا کہ اسے مہتاب سے اس قدر زیادہ محبت ہے کہ اس سے شادی کرنے پہ راضی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے مہتاب سے اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں یا اسے لکھی تھیں جنھیں مہتاب مجھ سے چھپاتی تھی۔ مہتاب نے پارسا کا ایک ہی خط مجھے دیا جو ابھی تک میرے پاس ہے۔ آپ پڑھنا چاہیں گے؟"

"ہاں ضرور!"

خانم بنیادی اپنے کندھے سے اپنا بیگ اتارتی اور اس میں سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالتی

ہے۔ وہ کاغذ میرے حوالے کرتی ہے اور میں سڑک پر واقع خوبصورت دکانوں کے شوکیسوں کی جاذبیت میں کھوئے ہوئے ہزاروں لوگوں کے درمیان چلتے ہوئے پارسا کا خط پڑھنے لگتا ہوں:

''کاش میں پتھر کا ایک ٹکڑا ہوتا۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا۔ مٹھی بھر مٹی ہوتا۔ کاس میں ایک جمعدار ہوتا۔ ایک نانبائی۔ ایک درزی، پھیری والا، ڈاکٹر، وزیر، سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا جوتے پالش کرنے والا، کاش میں کوئی ایسا شخص ہوتا جو تمھیں سرے سے جانتا ہی نہیں۔ کاش میرا دل پتھر کا ہوتا۔ کاش میرا دل ہی نہ ہوتا۔ کاش میں سرے سے موجود ہی نہ ہوتا۔ کاش تم نہ ہوتی۔ کاش ایسا ممکن ہوتا کہ ہم سب کچھ بلیک بورڈ ڈسٹر سے صاف کر سکتے۔ ہائے مہتاب! کاش میں تمھارے گھر کی ایک اینٹ ہوتا، یا تمھارے باغیچے کی مٹھی بھر مٹی۔ کاش میں تمھارے کمرے کے دروازے کی کنڈی ہوتا تاکہ تم ہر دن ہزار بار مجھے چھوتیں۔ کاش میں تمھاری چادر ہوتا۔ نہیں، کاش میں تمھارے پھیپھڑے ہوتا تاکہ تم اپنی سانسیں مجھ میں اتارتیں اور مجھ سے باہر نکالتیں۔ کاش میں ''تم'' ہوتا۔ کاش تم ''میں'' ہوتیں۔ کاش ہم دونوں ایک ہوتے۔ دو افراد پر مشتمل ایک شخص!''

تحریر پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میری روح کو ایک ہزار منزلہ عمارت کی چھت سے نیچے دھکیل دیا ہو۔ میرا سارا وجود ایک عجیب وغریب درد سے لبریز ہو جاتا ہے۔

''اس وحشت ناک واقعے کے بعد مہتاب بیمار پڑ گئی اور اپنے گھر کے ایک کونے کی ہو کر رہ گئی۔ اس کا سارا توازن بگڑ گیا تھا۔''

جب ہم ایک بڑے اسکوئر پر پہنچتے ہیں جہاں پہنچ کر چار باغ سڑک ختم ہو جاتی ہے، تو اچانک ہلکی ہلکی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ میں کاغذ اسے واپس کر کے اس سے پوچھتا ہوں:

''اس کا توازن بگڑنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

وہ کاغذ دوبارہ اپنے بیگ میں رکھ کر کہتی ہے:

''پارسا کی موت نے اس پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ماضی میں اور پارسا کی روح کے کسی حصے میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ وہ اپنا ماضی نہیں بھلا سکتی اور ہر رات برے خواب دیکھتی ہے۔ اس حادثے کے بعد میری حالت بھی بگڑ گئی اور میں ایک ماہر نفسیات کے کہنے

پر اصفہان چلی آئی تاکہ مہتاب سے، یونیورسٹی کے ماحول سے اور ہر اس چیز سے دور ہو سکوں جو کسی نہ کسی طرح مجھے پارسا کی یاد دلاتی ہے۔ اس بیچ میں نے صرف ایک بار اسے فون کیا لیکن باتوں کے دوران وہ اچانک انگریزی بولنے لگی۔ وہ جب بھی جذباتی ہو جاتی ہے، اپنی مادری زبان میں بات کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح اسے بات کرنے میں آسانی رہتی ہے۔"

بارش موسلا دھار ہو چکی ہے۔ ہم دونوں بری طرح بھیگ رہے ہیں۔ میں شہرہ بنیادی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ میں اس کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ واقعی کبھی نہیں بھولوں گا۔ پھر اسے خدا حافظ کہہ کر خود ہوٹل کی طرف روانہ ہو جاتا ہوں۔ فٹ پاتھ پر لوگ اپنی چھتریاں کھولنے لگتے ہیں اور اچانک کئی ہزار کالی چھتریاں لوگوں کے سروں پر سایہ فگن ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض دو دو کی شکل میں ایک چھتری کے نیچے پناہ لیے ہوئے ہیں۔ میں اپنے ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں ڈالے بیماری اور نزلہ زکام جیسی چیزوں کے بارے میں سوچے بغیر بارش کے نیچے چلتا، لمبی لمبی سانس لینے لگتا ہوں اور "صرف اور صرف آواز" کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں، جس کے الفاظ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

۱۹

تہران پہنچ کر میں سیدھا تحقیقاتی ادارہ جا کر وہاں سے مہرداد کو فون کرتا ہوں۔ اس کی امی کہتی ہیں کہ مہرداد اور علی رضا گئے ہیں۔ وہ کوئی کوئی نام بھی بتاتی ہیں جسے میں غلطی سے "مسلخ" (قتل گاہ) سن بیٹھتا ہوں اور حیرت سے پوچھتا ہوں: "مسلخ"؟

وہ کہتی ہیں: "مشہد! وہ علی کے ساتھ مشہد گیا ہے، زیارت کے لیے۔"

ان کی یہ بات میرے لیے اس قدر عجیب ہے کہ اگر وہ کہتیں کہ وہ دونوں ہواوے کے جزیروں کی سیر کرنے گئے ہیں تو مجھے جلد یقین آجاتا۔ میں فون کاٹ کر سایہ کو فون ملاتا ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ علی نے پارسا کے کمپیوٹر کی چند فائلوں کی پرنٹ لے کر انھیں ایک لفافے میں رکھ کر میرے حوالے کر دیا ہے کہ اسے آپ تک پہنچا دوں۔ میں سایہ سے کہتا ہوں کہ مجھے لگتا ہے کہ میرا پراجیکٹ ختم ہونے کو ہے اور شاید اگلے ایک مہینے تک ہم شادی کرلیں گے اور مجھے اس پریشانی سے چھٹکارا مل جائے گا۔ وہ اختصار سے کام لیتے ہوئے کہتی ہے: "واقعی؟ واقعی تمھیں چھٹکارا مل جائے گا؟" میں میز کے شیشے کے نیچے رکھی سایہ کی تصویر پر ایک نگاہ ڈال کر اس سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی انگلیاں ریسیور پر رکھ دے۔ جب وہ ایسا کرتی ہے تو میں اپنے ریسیور کو چوم لیتا ہوں اور پھر کہتا ہوں: "اچھا تھا، بہت اچھا تھا۔"

"بڑے رومینٹک ہو رہے ہیں آپ!"

"آئی لو یو سایہ۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔"

"میں خوش ہوں۔ اس بڑی دنیا میں، میں اسی چھوٹی سی بات پر خوش ہوں۔ حتیٰ کہ اگر ہم کبھی شادی نہ کر سکیں لیکن آپ مجھ سے محبت کریں تو میں اسی بات پر خوش ہوں۔ میں آپ کی محبت پر خوش ہوں۔"

میں کہتا ہوں: "کیوں؟ تم یہ بات کیوں کہہ رہی ہو؟ تم ایسا کیوں سوچتی ہو کہ ہماری شادی نہیں ہو سکتی؟ تمھارے ابو نے کچھ کہا ہے؟"

"اس بات کا میرے ابو سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ خدا کی طاقت میرے ماں باپ یہاں تک کہ ہماری اپنی خواہش سے بھی بہت زیادہ ہے۔ خدا نے حضرت موسیٰ (ع) سے کہا کہ مجھے دو موقعوں پر ہنسی آتی ہے؛ ایک جب میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں لیکن دوسرے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرا جب میں نہیں چاہتا کہ کوئی کام انجام پائے لیکن لوگ وہ کام انجام دینے کے لیے سخت محنت کرتے ہیں۔"

اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے اور میں تھوڑا غصے میں بھی ہوں۔ پھر بھی خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھتا ہوں: "کیا ہوا ہے؟ اگر کچھ ہے تو میں ابھی کے ابھی جاننا چاہتا ہوں۔ اگر نے میرے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی دوسرا فیصلہ لیا ہے تو بھی میں ابھی اس سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔"

میں ریسیور دوسرے ہاتھ میں لیتا ہوں اور اس کے جواب کا منتظر ہوں۔ سایہ چپ ہو جاتی ہے:

"سایہ! ریسیور تمھارے ہاتھ میں ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا اور امید کرتی ہوں کہ آپ کو بھی کچھ نہ ہوا ہو۔"

میں ٹیلیفون کی تار اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹتا ہوں:

"مجھے آج بھی تم سے محبت ہے، بالکل پرانے دنوں کی طرح۔"

''میں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں لیکن مجھے آپ کی فکر رہنے لگی ہے۔''

''کیسی فکر؟ سایہ تمھیں کیا موت آئی ہے؟''

''میں معذرت خواہ ہوں۔ واقعی معذرت چاہتی ہوں۔ کبھی کبھی کسی بھی قیمت پر خدا کو اپنی زندگی سے محو نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی ممکن ہے ایک مدت تک اسے بھلا دیا جائے لیکن پوری طرح زندگی سے محو نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم میرے لیے اس کا مطلب خود زندگی کو محو کرنے کے برابر ہے۔ زندگی کو محو کرنے کا مطلب ہے موت۔ کیا آپ اس بات کو نہیں مانتے؟''

''میں تمھیں کسی کام کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔''

''میں بھی ایک مرے ہوئے انسان کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ یونس، میرا خیال ہے کہ اگر آپ خدا کو اپنی زندگی سے نکال دیں تو آپ میں اور ایک مرے ہوئے انسان میں زیادہ فرق نہیں۔ اب یہ میرا اپنا ماننا ہے یا شاید یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میں فرض کرتی ہوں کہ خدا زندگی کا سرچشمہ ہے اور جو کوئی اس سرچشمے سے الگ ہو جائے، اس میں ذرہ بھر زندگی نہیں ہے۔''

میں زور سے ریسیور کو اس کی جگہ پٹخ دیتا ہوں۔ غصے سے میری انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ میں مزید ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔ مجھے لگتا ہے کہ سایہ خواہ مخواہ آسمانی مسائل کو سماجی مسائل سے گڈمڈ کر رہی ہے۔ اس حوالے سے وہ دیگر افراد سے کہیں زیادہ علی سے مشابہ ہے۔ میں چیزوں کو اس طرح دیکھنا نہیں چاہتا یا دیکھ نہیں سکتا۔

میں دراز سے مہتاب کرانہ کا پتہ نکالتا اور کمرے سے باہر جانے ہی والا ہوں جب ٹیلیفون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگتی ہے۔ میں بھوت زدہ کسی شخص کی طرح ٹیلیفون کو گھورنے لگتا ہوں لیکن ریسیور اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ فون کی گھنٹی چند بار بجتی اور پھر بند ہو جاتی ہے۔ میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہوں۔ ایسے میں فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگتی ہے۔ اس بار میں فوراً ریسیور اٹھاتا ہوں۔ وہی لڑکی ہے جس کے بارے میں مجھے لگا تھا کہ رانگ نمبر ملا رہی ہے۔ اس بار وہ فارسی میں بات کر رہی ہے اور صاف ظاہر ہے کہ پارسا کے بارے میں بول رہی ہے۔ یہ مہتاب کرانہ ہی ہے۔ یقیناً اس نے اخبار میں میرے اشتہار کے بارے میں پڑھا ہے اور بار بار فون

کر کے مجھے حقیقت سے آشنا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن یوں لگ رہا ہے جیسے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی بولنا اس کے لیے بہت مشکل ہے۔ میں ریسیور مضبوطی سے کان سے لگاتا اور اس کی باتیں سننے میں مگن ہو جاتا ہوں۔ اگرچہ میں پارسا کی طرح اس کی "آواز" میں گم نہیں ہوتا لیکن اس کی ایک ایک بات بڑے غور سے سنتا ہوں:

"اس نے سب کچھ سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا نہیں کر پایا۔ اس نے کوشش کی کہ فزکس، ریاضی اور یہاں تک کہ فلسفے کی مدد سے ہر چیز کا اندازہ لگائے لیکن اسے اچانک معلوم ہوا کہ کائنات میں ایسی بھی چیزیں ان چیزوں سے اندازہ لگانا یا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے وہ حیران و پریشاں ہو گیا اور دھنستا چلا گیا پھر اس نے اپنے سارے حساب کتاب پر خطِ تنسیخ پھیری اور انھیں نئے سرے سے شروع کیا۔ اس نے تمام اجزا شمار کیے لیکن اسے لگا کہ اس بیچ کوئی کڑی غائب ہے۔ اس کے سارے فارمولے ادھورے رہ جاتے تھے۔ وہ پھر حیران و پریشاں ہو گیا اور دھنستا چلا گیا۔ اس نے فطرت، لیبارٹریوں اور کتب خانوں کی خاک چھانی لیکن کچھ نہیں ملا۔ اس نے واپس لوٹنا چاہا لیکن ایسا کر نہیں پایا، واپسی کا راستہ بھول بھلیوں کی طرح پیچیدہ تھا۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا لیکن ایسا بھی نہیں کر پایا۔ آگے بند گلی تھی۔ پس وہ اور الجھ گیا، لڑکھڑا اور مزید دھنستا چلا گیا۔ اور دھنستا چلا گیا۔ وقت ختم ہو رہا تھا اور وہ ایک ہی دھندلے راستے پر بار بار آگے بڑھتا اور واپس آتا تھا۔ آگے بڑھتا تو دھنس جاتا۔ پیچھے ہٹتا تو اور دھنستا چلا جاتا تھا۔ اچانک اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا جواب تک پایا تھا اور اس کے لیے سوالات کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ پہیلیاں بڑھنے لگیں اور اس کے ذہن میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کی روح کا چراغ بجھ گیا اور وہ تاریکی سے بھر گیا۔ وہ اندھا ہو گیا اور اسے اچھے برے کی تمیز نہ رہی۔ اس طرح وہ اور دھنس گیا۔ اب اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے وہ خود ایک مسئلے میں بدل چکا تھا اور کسی کو آ کر اسے حل کرنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔ اس نے کہا کہ میں نے خود اسے حل کر لیا ہے۔ بولا: اس کے تمام مشکل سوالات کا جواب میں ہی ہوں۔ جب اسے معلوم ہو گیا کہ اصل جواب کیا ہے تو اس نے اپنے سارے اوزار دور پھینک دیے اور ان سے دور بھاگنے لگا۔ تاہم اتنا کافی نہیں تھا۔ اسے مزید بھاگنا چاہیے تھا۔ اسے مزید دور جانا

چاہیے تھا۔ خود سے کوسوں دور۔ اسے خود کو جھٹلانے کی ضرورت تھی لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس لیے وہ مزید دھنستا چلا گیا۔ اس نے جو پتھر اٹھایا تھا، بڑا بھاری تھا۔ اس لیے اس کا توازن ٹوٹ گیا اور اس کا سارا نظم و ضبط بکھر گیا۔ اس بے نظمی نے اسے پریشان کر دیا اور وہ اپنے گرد گھومنے لگا تاکہ اس سے چھٹکارا حاصل کر لے لیکن مزید دھنستا گیا۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اوپر اٹھا؛ اوپر، اور اوپر! لیکن یہ بھی کافی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے اندر بکھر گیا۔ چھوٹا ہوتا گیا۔ اور چھوٹا۔ اور اس اونچائی سے نیچے گر پڑا۔ اس طرح تباہ و برباد ہو گیا۔"

مہتاب کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں اور وہ ریسیور رکھ دیتی ہے۔ میں تحقیقاتی ادارے سے باہر نکل آتا ہوں اور گاڑی میں بیٹھ کر مہتاب کے گھر کی طرف جانے لگتا ہوں۔ میرے ذہن میں سایہ اور مہتاب کی باتوں سے ایک طوفان برپا ہے۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے مہتاب کرانہ کے گھر کی طرف بڑھنے لگتا ہوں۔ اب مجھے تقریباً یقین ہو چلا ہے کہ پارسا کی خودکشی کی سوشیالوجی پر مبنی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ سوچ کر کہ پارسا کی خودکشی کے پیچھے کوئی معاشرتی وجہ موجود نہیں ہے، میں ناامیدی کی وجہ سے پاگل ہونے لگتا ہوں۔ اس بات کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس اپنے تھیسز کے دفاع کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔ اب میں اس پندرہ منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ گیا ہوں جس کی آٹھویں منزل پر مہتاب کرانہ رہتی ہے۔ میں اسے وہ منحوس خودکشی یاد دلا کر اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ ویسے بھی اب کہنے کو رہا بھی کیا ہے؟ ہر چند اس کی باتیں میرے پلے نہیں پڑی ہیں، پھر بھی مجھے لگ رہا ہے جیسے اس نے ٹیلیفون پر ہی ساری باتیں کہہ دی ہیں۔ میں کچھ دیر آٹھویں منزل کی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا ہوں اور پھر دوبارہ اپنی گاڑی کی طرف پلٹ جاتا ہوں۔ ساری سڑکیں مجھے بہت جانی پہچانی لگ رہی ہیں۔ اچانک میری نگاہیں مہتاب کے اپارٹمنٹ کی سامنے والی عمارت پر پڑتی ہیں اور میں ہکا بکا رہ جاتا ہوں۔ نگین آبی عمارت کی آٹھویں منزل کے ٹیرس پر گھریلو حشرات کش پاؤڈر کی فیکٹری کے سیلز آفس کا سائن بورڈ سورج کی روشنی میں چمک رہا ہے۔

۴۰

اگلی صبح میں پارسا کی یادداشتوں کا پیکٹ وصول کرنے کے لیے سایہ کے گھر جاتا ہوں۔ وہ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتی ہے تو مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتی ہے۔ مجھے اندر آنے کو نہیں کہتی۔ میں کہتا ہوں کہ میں پارسا کی یادداشتوں کے لیے آیا ہوں۔ وہ اندر چلی جاتی ہے اور چند منٹ بعد ایک بڑے سے پیکٹ کے ساتھ واپس آتی ہے اور بالکل اجنبیوں کی طرح وہ پیکٹ میرے حوالے کر کے اس انتظار میں رہنے لگتی ہے کہ میں وہاں سے دفع ہو جاؤں۔ میں کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن لاکھ ڈھونڈنے پر بھی میرے ذہن میں مناسب الفاظ نہیں آتے۔

وہ کہتی ہے: ”میں برسوں تک آپ کی منتظر رہی۔ ہمیشہ کھڑکی سے نیچے جھانکتی تھی جب تک آپ اوپر نہ آجاتے۔ ساری ٹیلی فون کالیں اس لیے اٹھاتی تھی کہ شاید آپ نے فون کیا ہو اور آپ کی آواز سن سکوں۔ دروازے کی گھنٹی بجتی تو یہ سوچ کر فوراً دروازہ کھولتی کہ شاید دوسری طرف آپ کھڑے ہوں۔ دوسری تمام لڑکیوں کی طرح میری بھی آرزو تھی کہ میرا نصیب اچھا ہو اور مجھے لگتا تھا کہ آپ کے ساتھ رہ کر میرا مقدر سنور جائے گا، لیکن میں یہ بات نہیں جانتی تھی کہ چاہنے میں اور نصیب اچھا ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ یونس، اگر آپ نے خدا کو ہمارے درمیان سے نکالا تو سمجھو ہم دونوں کو نکال دیا۔ مجھے یا تو خدا کو آپ پر قربان کرنے پڑے گا یا خدا کے لیے آپ کے عشق سے گزرنا پڑے گا اور میں

نے دوسرا راستہ چن لیا ہے یونس۔"

پھر وہ اپنی چادر چہرے پر ڈال کر روتے ہوئے کہتی ہے:

"یہ زندگی کا سب سے مشکل کام ہے۔ آہ یونس، پہلے عشق کے لیے دوسرے عشق کا گلا گھونٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ نے کیوں مجھے اس حال میں مبتلا کیا؟ یونس، آپ کو کوئی حق نہیں تھا مجھے خود پر عاشق کرنے کا اور خود پر عاشق کرنے کے بنانے کے بعد سارا نظام درہم برہم کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں تھا! یونس! آپ کو کوئی حق نہیں تھا اس ذات پر شک کرنے کا جس نے ہمیں ایک دوسرے سے ملایا تھا۔ آپ نے تمام چیزوں کو ٹھوکر مار دی یونس! مجھے دوسروں کے خداؤں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے لیکن آپ کو میرے اور اپنے خدا کے بارے میں اس بے رحمی سے شک کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آپ سے ملنے کے بعد میں ہمیشہ نماز کے بعد خدا سے کہتی تھی کہ وہ وجود رکھنے والا بہترین خدا ہے۔ یونس! یہ مت کہیں کہ آپ نے نمک حرامی کی ہے، یہ مت کہیں کہ یہ سب بکواس ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر خدا کی مرضی نہ ہوتی تو اب تک میرے ابو سو بار یہ رشتہ توڑ چکے ہوتے۔ آہ یونس! آپ خدا کے ساتھ ایسا کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟ جو کام آپ نے خدا کے ساتھ کیا ہے، کوئی اپنے نوکر کے ساتھ بھی نہیں کرتا!"

وہ دوبارہ رونا شروع کر دیتی ہے۔ میں وہیں بت بنا کھڑا رہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے، کہہ ڈالے تا کہ اس کا من ہلکا ہو جائے۔ وہ کہتی ہے: "آپ نے خود ہی کہا تھا کہ ایک رات آپ نے خواب دیکھا تھا کہ آپ اور موسیٰ کسی صحرا میں جا رہے تھے جب آپ نے خدا کی آواز سنی کہ 'تم کیا ڈھونڈ رہے ہو؟' اور آپ نے بھی کہا تھا کہ 'ہم تیری تلاش میں ہیں' تب اس آواز نے کہا تھا 'مجھے ڈھونڈنے کے لیے تمھیں دشت و صحرا میں بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو تمھارے خالی دسترخوان پر ملوں گا۔ تمھاری ماں کے چہرے کی جھریوں میں۔ تمھاری دادی کی کھانسیوں میں۔ تمھارے دادا کے ماتھے کی لکیروں میں۔ اس عورت کی فریاد میں جو اپنا بچہ جن رہی ہے، ایک فقیر اور بیچارے انسان کے ہاتھوں کے چھالوں میں، جوان لیکن مفلس لڑکیوں کی آرزوؤں میں جن کی آرزو ہے کہ کوئی سفید گھوڑے پر سوار آئے اور انھیں اس مفلسی سے نجات دلائے

جس میں وہ گھری ہوئی ہیں، اس ناامید باپ کی موٹے شیشوں والی عینک میں جس کی جیب میں پیسے نہیں ہیں اور وہ اپنے بیمار بچے کو اس ڈاکٹر سے اس ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے، پرائمری اسکول کے دو بچوں کے دلوں میں جو ایک پینسل کی خاطر سڑک پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں، اس مرد کے دل میں جسے خالی جیب رات کو گھر جانا ہے لیکن اپنے بیوی بچوں سے شرمندگی کی وجہ سے جا نہیں پاتا، اس مکینک کی بیوی کے دل میں جس کی خواہش ہے کہ ہر رات جب اس کا شوہر گھر لوٹے تو اس کے ہاتھ کام، آئل اور گریس کی وجہ سے کالے ہوں تاکہ بیوی سمجھ جائے کہ آج شوہر کچھ کما کر آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے شوہر کے ہاتھ دیکھتی ہے کہ کالے ہیں یا نہیں؟ اس شوہر کے دل میں کہ اگر اس کے ہاتھ گریس سے کالے نہ ہوں تو چپ چاپ جا کر ایک کونے میں لیٹ جاتا ہے لیکن اس کی بیوی کی آواز اسے سونے نہیں دیتی جو مسلسل اپنے بچوں سے کہتی ہے: ''اللہ مالک ہے، اللہ مالک ہے!'' اس بیچارے فلسفی کے افکار میں جو اپنی ''ذات'' کا اثبات چاہتا ہے لیکن ایسا کر نہیں پاتا، اس عابد کی راتوں کی طویل نمازوں میں جو اپنی شبانہ خلوتوں کا سودا دنیا کی کسی بھی چیز سے نہیں کرنا چاہتا، اس شخص کی سرخ آنکھوں میں جسے بے جرم و خطا مارا گیا ہے لیکن وہ شرمندگی کے مارے اپنے آنسوؤں کا راستہ روکے ہوئے ہے، اس باپ کے گہرے دکھ میں جس کے جوان بیٹے کا جنازہ محاذ سے لایا گیا ہے اور وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے اور اس کا اپنا چہرہ آنسوؤں سے شرابور ہے، چھ ماہ کے اس بچے کی زبان میں جس کا گلا پیاس سے سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا لیکن اس کی پیاس بجھانے کے لیے اسی گلے پر تیر مارا گیا، اس بچے کے باپ کی شرمندگی میں جو اپنے ننھے بچے کو چھدے ہوئے گلے کے ساتھ اس کی ماں کی گود میں ڈالتا ہے، شہید کے جسم پر پڑنے والی مٹی میں، اس بچے کے آنسوؤں میں جو پہلی بار باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر گریہ کناں ہے اور جو ٹھیک سے یتیمی کا مطلب بھی نہیں جانتا، انسانوں کی تنہائی کے لمحات میں، انسانوں کی لاچاری میں، لاچاری میں، لاچاری میں، 'یا اللہ! اب میں کیا کروں' میں، عید کی رات بچوں کی خوشیوں میں، دلہنوں کی خوشی میں، بیوہ عورتوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے غموں میں، بچوں کے کھیل میں، سچائی میں، سرشاری میں، پاکیزگی میں، توبہ میں، بار بار ٹوٹتے ہوئے توبہ میں، گناہ سے پشیمانی میں،

میری طرف لوٹنے میں، 'مجھ سے غلطی ہوگئی' میں، 'دوبارہ ایسا نہیں ہوگا' میں، 'میں وعدہ کرتا ہوں کہ اچھا بچہ بن کر رہوں گا' میں، 'مجھے تم سے محبت ہے' میں، ان انسانوں میں جو خود جنت بن گئے ہیں، ایسے انسانوں میں جو خود چلتی پھرتی جنت ہیں، بار بار ایسے ہی انسانوں میں، ایسے انسانوں کی نمازوں میں، ایسے انسانوں کے اشکوں میں، ایسے انسانوں کے غموں میں، مونس کی پیشانی میں جسے وہ دن میں تین بار مصلے پر رکھتی ہے، سایہ کے ہاتھوں میں جو ہر روز وہ قرآن کھولتے ہیں جو آپ اس کے لیے لائے تھے، آپ کے دل میں جس میں طوفان برپا ہے، آپ کی ساری ادھر ادھر کی معلومات میں، آپ کے ہاتھ پیر چلانے میں، آپ کے شک کرنے میں، آپ کی خواہش میں، سایہ سے آپ کی محبت میں اور اور۔۔۔"

وہ اپنی بات مزید جاری نہیں رکھ پاتی۔ اندر چلی جاتی ہے اور دروازہ بند کر دیتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بھی دوسری طرف دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی ہے اور اس میں ہلنے جلنے کی صلاحیت نہیں۔ میں اپنے ہونٹ دروازے پر وہاں رکھتا ہوں جہاں میرے گمان میں اس وقت اس نے اپنی انگلیاں رکھی ہیں، اور اس کی انگلیاں چوم لیتا ہوں۔

میں ایک خالی اور خاموش پارک میں بیٹھا ہوں اور سایہ کے دھماکہ خیز جملوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ چند لڑکے میرے سامنے پتنگ اڑا رہے ہیں۔ میں نے چھری نہ صرف اپنے سینے میں بلکہ سایہ کے دل میں بھی اتاری ہے۔ تف ہے ایسی زندگی پر! انسان ہستی کی حقیقت سمجھنے میں اتنے کمزور اور لاچار کیوں ہیں؟ پھیری والے، جمعدار، درزی، باورچی، سینڈوچ بیچنے والے، ٹیکسی ڈرائیور یہاں تک کہ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات، فلسفی اور دیگر بہت سے لوگ اس پیچیدہ زندگی کو کہاں سمجھے ہوں گے؟ مجھے ہمیشہ ایسے لوگوں پر ترس آتا ہے جو اس دنیا میں اپنا بوجھ بھی نہیں سہار سکتے۔ ایسے انسان جن کی جہالت نے انھیں نہ صرف انسان اور کائنات کو سمجھنے سے عاجز کر دیا ہے بلکہ مفلسی، بیماری اور موت جیسے عظیم مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بھی ان سے چھین لی ہے۔ جب ایک جمعدار کا بچہ ہسپتال میں اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑتا ہے تو وہ اس تلخ واقعے کے مختلف

پہلوؤں کو بھی سمجھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ جب ایک پھیری والے کے پیر ٹرک کچل کر گزر جاتی ہے اور اسے تمام عمر اپاہج ہو کر جینا پڑتا ہے تو پھیری والا کسی چیز پر اعتراض کیے بغیر اپنی ساری زندگی اپاہج ہونے کے عذاب میں گزار دیتا ہے اور اتنا بھی نہیں جانتا کہ اسے اس دنیا میں صرف ایک بار جینے کا موقع ملا تھا اور یہ موقع اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیا گیا ہے۔

پارک میں موجود بچوں نے اپنی کاغذی پتنگوں سے ڈور باندھ رکھی ہے اور پارک کی ایک پکی سڑک پر دوڑ رہے ہیں تاکہ ان کی پتنگیں ہوا کے دوش پر اوپر اڑ سکیں۔ میں اپنی جیب سے پارسا کی تحریریں باہر نکال کر انھیں دوبارہ پڑھنے لگتا ہوں:

''جب تم نے طلوع کیا تو میں وہاں اوپر کھڑا تھا، شیشے کے پیچھے۔ تمھیں دیکھنے میں مگن۔ آہ! کبھی کبھی نیچے کھڑا ہونا اوپر کھڑے ہونے سے کتنا بہتر ہوتا ہے! تمھیں اندازہ نہیں تھا کہ میں کیسا عجیب کھیل کھیلنے لگا ہوں۔ تم نیچے ایک بڑی نیلی فضا کی طرح چمک رہی تھیں اور مجھے دنیا میں ہر نیلے رنگ پر رشک آرہا تھا۔ پھر ہم دونوں اس سفید گھوڑے پر سوار ہو جاتے جس کے پنکھ نہیں تھے اور جو سرپٹ دوڑتے ہوئے سرسبز سڑکوں کو طے کرتا، انھیں گنتا، انھیں سونگھتا اور طے کرتا۔ دوبارہ انھیں گنتا، دوبارہ طے کرتا۔ سہ بارہ گنتا اور طے کرتا اور میرا دل کتنا چھوٹا تھا اور تمھارے لیے کتنا مضطرب۔ مَیں چاہتا تھا کہ وہ ہزاروں بار ساری سڑکیں طے کرے تاکہ میرا دل بڑا ہو جائے، اور بڑا اور بڑا۔ اتنا بڑا ہو جائے کہ تم پوری طرح اس میں سما جاؤ۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور نہیں ہوگا۔ تم نے کہا چلو وہاں، اُدھر دیوار کے پاس۔ میں چاہتا تھا کہ دیوار کو ایسی لات ماروں کہ گر کر پاش پاش ہو جائے تاکہ ہم دونوں اس بند گلی سے رہا ہو سکیں لیکن تم چلائی اور میں صرف تمھارے لیے دیوار سے لگ کر کھڑا ہوا اور ہم دونوں دیوار کو گھورنے لگے جو کس قدر بلند اور مضبوط تھی۔ دیوار ہماری توانائی کا مذاق اڑا رہی تھی اور مجھے سخت غصہ آرہا تھا۔ پھر تم نے اپنی سبز آنکھیں مجھے دے دیں جو کس قدر نیلی تھیں! اور میں نے اپنی آنکھیں تمھارے حوالے کر دیں لیکن تمھیں اب بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کیسا عجیب وغریب کھیل کھیلنے لگا ہوں۔ پھر میں تمھارے ہاتھوں کو گھورنے لگا اور ان میں مجھے زندگی کی ساری معصومیت ایک ساتھ نظر آئی اور میں کانپ اٹھا۔ وہ ایک سمندر کی طرح نیلے تھے، جیسے آسمان کا ایک ٹکڑا ہو جو زمین پر گر گیا ہو۔ تب میں

نے ہرے رنگ کے قلم سے ان نیلے ہاتھوں کے تقدس کو چوما اور جان گیا کہ خدا بھی نیلا ہے۔"

یہ دیکھ کر کہ پارسا نے ایسا محبت بھرا اور احساسات سے لبریز خط لکھا ہے، مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔ میں کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں اور پارسا کا ایک اور خط نکال کر پڑھنے لگتا ہوں:

"میں جتنا تمھیں پیتا جاتا ہوں، میری پیاس اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہے، اے سب سے زیادہ پیاسا کر دینے والے پانی! اے سب سے کڑوی مٹھاس! اے سب سے ہلکے وزن! تم میری زندگی کی سب سے غمگین خوشی ہو۔ تم میری زندگی کی سب سے خوش کن اداسی ہو۔ اے سادہ لیکن پیچیدہ واقعے! تم مجھے جلا کر بھسم کیوں نہیں کرتی۔ اے میری زندگی کی سب سے ٹھنڈی آگ! اے کائنات کے مہاجر پرندے کے سب سے بھاری لیکن ہوا میں تیرتے ہوئے پنکھ! پرندوں کا شہر کہاں ہے؟"

مجھے ایک اور خط بھی ملتا ہے، جس پر 2 اکتوبر کی تاریخ درج ہے، یعنی پارسا کی خودکشی سے صرف ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ:

"انھیں گھروں میں سے کسی ایک گھر میں، یہیں آس پاس، کسی کا دل جل رہا ہے۔ تم چھت پر چڑھ کر دیکھو تو تمھیں بھی نظر آئے کہ ایک کھڑکی سے آگ باہر لپک رہی ہے۔ کسی کا دل جل رہا ہے۔ تم نے آنے میں تھوڑی دیر کر دی۔ ایک لمبی سڑک کے انتہائی سرے سے، ایک سایہ کی طرح پریشان۔ تم نے آنے میں ذرا دیر کر دی لیکن ایسی چمک دکھائی کہ ایک شخص کا دل جل اٹھا۔ مجھے کہتے ہیں کہ کچھ نہ کہو۔ مجھے کہنا بھی نہیں چاہیے لیکن کسی کا دل بری طرح جل رہا ہے۔ ایک شخص کا دل یہاں جل کر راکھ ہو رہا ہے۔ تم نے آنے میں ذرا دیر لگا دی لیکن آتے ہی ایک بیچارے کے دل کی طرف بڑھ کر اس کے سینے میں ہاتھ ڈالا، اس کا دل نکالا، اسے آگ میں جھونکا اور پھر دوبارہ اس کے سینے میں رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کا دل جل رہا ہے اور راکھ ہو رہا ہے۔ کوئی ہے جو تمھاری آنکھوں میں ڈوب رہا ہے۔ کوئی ہے جو تمھاری آپس میں ملی ہوئی انگلیوں میں گم ہو رہا ہے، کوئی ہے جو بھڑک رہا ہے۔ کسی کا دل بری طرح جل رہا ہے۔ کاش کوئی اس کے دل پر پانی کی ایک بوند گرا دے۔ شاید اس طرح اس کا دل بجھ جائے۔ اتنے سارے چپ چاپ گھروں میں ایک گھر ایسا بھی ہے جس میں کسی کا دل جل کر راکھ ہو رہا ہے۔ ایک شخص نے تمھاری بانہوں میں چھلانگ لگا کر ان میں ڈوب

جانے کی تمنا کی ہے۔کوئی تمھیں دیکھنا چاہتا ہے، نہیں نہیں، تمھیں سننا چاہتا ہے۔کوئی ہے تمھاری آواز میں ڈوبنا چاہتا ہے۔کوئی تمھیں اٹھا کر پہاڑ کی چوٹی پر لے جانا چاہتا ہے اور پھر خود وہاں سے نیچے دوڑ کر اور پہاڑ کے دامن میں اتر کر وہاں سے تمھیں دیکھنا چاہتا ہے۔کوئی ہے جو تمھیں قریب سے دیکھنے سے ڈرتا ہے۔کوئی ہے جو تمھاری آنکھوں میں تیرنا چاہتا ہے۔کوئی ہے جسے یہاں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔کوئی سراسر موسمِ سرما میں بدل چکا ہے۔کسی کا دل بری طرح بھر آیا ہے اور اس کا دم گھٹ رہا ہے۔جب تم بات کرتی تھیں تو کوئی تمھارے الفاظ نہیں، تمھاری آواز سنتا رہا تھا، صرف اور صرف تمھاری آواز۔کوئی تمھاری آواز میں گم ہو چکا تھا۔کوئی تمھیں شدت سے یاد کر رہا ہے۔انھیں گھروں میں سے کسی ایک گھر میں، یہیں کہیں، کسی کا دل جل رہا ہے۔کوئی اس دل پر پانی کی ایک بوند ہی گرا دے شاید اسے سکون آ جائے۔"

پارک میں بعض لڑکوں کی پتنگیں ہوا میں اڑنے لگی ہیں جنھیں دیکھ کر وہ اس قدر زور زور سے چلا رہے ہیں کہ میں پارسا کی تحریروں پر دھیان نہیں دے پا رہا ہوں:

"تم کتنی عجلت میں آئی تھیں! میں نے کہا چلی جاؤ لیکن تم نہیں گئیں اور تم نے دوبارہ دروازے کی کنڈی بجائی۔میں نے کہا: کافی ہے۔یہاں سے چلی جاؤ۔میں نے کہا: یہاں سب کچھ بوجھل ہے اور بھیڑ بھاڑ۔یہاں تمھارے لیے کوئی جگہ نہیں، لیکن تم نہیں گئیں۔بیٹھ کر رونے لگی۔یہاں تک کہ میرے گال بھی بھیگ گئے۔پھر میں نے دروازہ کھول کر کہا: آؤ اور دیکھ لو یہاں کس قدر بھیڑ ہے! اور تم نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ وہاں کس قدر فزکس، فلسفہ، آرٹ، منطق، کتاب، میگزین، اخبار، پیمانہ، کمپیوٹر، کاغذ، باتیں، باتیں، باتیں، تنہائی، آنسو، زخم، ناامیدی، دل تنگی، آشوب، دُھند، دُھند، دُھند، تاریکی، سکوت، ڈر، اندوہ اور غربت آپس میں گڈمڈ پڑے ہوئے تھے اور میرا دل نہایت پریشان تھا۔اور میرا دل اندوہ ناک، بھیڑ بھاڑ سے بھرا اور بوجھل تھا۔تم نے کہا: یہاں کوئی بھید نہیں ہے! میں نے پوچھا: بھید؟ تم نے کہا: میں بھید ہوں۔اور پھر تم آئیں پیمانوں کے قریب تک۔پھر تمھاری آنکھوں نے اس سبز فریم کے درمیان سے جادو پھونکا اور جیسے ایک عجیب و غریب آندھی اٹھی۔اس قدر شدید کہ میرا دل سینے سے باہر آتے آتے بچا اور میں نے دیکھا کہ ساری باتیں، سارے

فلسفے، سبھی کتابیں، تمام پیمانے، ایک ایک کاغذ، سب دکھ، ہر طرح کی تاریکی، خوف، آشوب، دھند، سکوت، زخم، دل تنگی، غربت اور اندوہ ریگستانوں کی ریت کی طرح دل سے اٹھ کر آندھی میں کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح بکھر رہے تھے۔ گھر سج گیا۔ گھر روشن ہوا اور خالی اور بہت ہی ہلکا اور تم نے میرے دل میں اتر آئیں۔ میں نے پوچھا: کون ہے؟ تم نے کہا: بھید!''

پارسا کے نام مہتاب کی ایک تحریر بھی ہے جو اس نے پارسا کی خودکشی سے ایک رات پہلے لکھی ہے:

''مجھے جادو نہیں آتا۔ میں نے صرف اپنی بڑی اور بھاری روح پھیلائی۔ مجھے جادو نہیں آتا۔ تم نے کہا کہ تم موسم سرما میں بدل گئے ہو اور مجھے تمھاری حالت پر ترس آیا۔ اس لیے میں نے صرف اپنی بڑی اور بھاری روح ایک چادر کی طرح تم پر پھیلا دی اور عشق کا ورد پڑھا اور تم سلگ اٹھے۔ مجھے جادو نہیں آتا۔ تمھاری دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں اور میری روح تمھاری دھڑکنوں کی وجہ سے زندہ تھی۔ میں نے کہا: 'مجھے تم سے محبت ہے' اور تمھاری سانسیں تھم گئیں اور میری روح کی تڑپ بھی ختم ہوگئی۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں میں نے تمھیں مار تو نہیں دیا؟ میں نے تمھاری جان تو نہیں لے لی؟ پھر میں نے اپنی روح تمھارے اوپر سے اٹھالی، لیکن تم وہاں نہیں تھے۔ تم غائب ہو چکے تھے۔ میں نے کہا نا کہ مجھے جادو نہیں آتا۔''

میں پارک میں موجود بچوں کی طرف دیکھتا ہوں جو ایک ایک کر کے اپنی پتنگیں اڑا رہے ہیں اور دل کی گہرائیوں سے خوشی سے چلا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بچہ جس کی پتنگ کی ڈور کٹ چکی ہے، ایک کونے میں اداس بیٹھا ہوا ہے۔

کاغذات کے درمیان ایک نوٹ علی نے بھی میرے لیے لکھا ہے:

''میں نے پارسا کے نوٹس پڑھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ عاشق ہو چکا ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس کی خودکشی کا اس کی محبوبہ سے کوئی لینا دینا ہوگا۔ شاید اس نے خودکشی اس لیے کی کیونکہ اس کی سمجھ عشق کی بلندی سے تھوڑی کم تر تھی۔ عشق پر عبور حاصل کرنے کے بجائے وہ اس مفہوم کے رعب سے دب گیا جو اس کے لیے ایک نئی بات تھی۔ اس نے اپنی محبوبہ سے نہیں بلکہ عشق سے بری طرح

شکست کھائی۔ حتیٰ کہ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کی محبوبہ نے اسے عشق کی تفہیم میں مدد دینے کی بھی کوشش کی تھی لیکن پارسا کا ذہن عشق کے تمام پہلوؤں اور پیچیدہ مفاہیم کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ گویا عشق کا سورج پارسا پر اس قدر عجیب و غریب انداز میں چمکا تھا کہ اس کے پیمانوں سے اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اسے اپنی نوٹ بک میں باقی چیزوں کی صف میں قرار دینے سے قاصر تھا۔ اور یونس! یہ بالکل ایسے ہی جیسے تم خدا کے معنی اپنی زندگی کے دیگر مفاہیم کے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ جب خدا چھوٹے بچوں کی معصومیت میں سردیوں کی چمکیلی برف کی طرح چمکتا ہے تو اس وقت تم کہاں ہوتے ہو یونس! واقعی اس وقت تم کہاں چلے جاتے ہو؟ ممکن ہے خدا نے اس کائنات میں کہیں بھی خود کو اتنا آشکار نہ کیا ہو جتنا بچوں کی معصومیت میں۔ مجھے تو کبھی کبھار بچوں میں خدا کی شدید موجودگی دیکھ کر خوف آتا ہے اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ میرا دل اس زور سے دھڑکتا ہے کہ میں حیرت کے عالم میں دوڑ لگا تا ہوں تا کہ ان بچوں کی انگلیوں کے درمیان سے خدا کو چن سکوں۔ کہاں ہو یونس؟ کیا تم مجھے سن سکتے ہو؟"

میں سارے کاغذ لفافے میں رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ جاتا ہوں۔ چند قدم آگے بڑھتا ہوں۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں ایک درخت سے ٹیک لگا تا ہوں کہ میری حالت قدرے بہتر ہو۔ تھوڑی دیر بعد، پارک کی سڑک سے عبور کرتے وقت میری نظریں ایک چھوٹے بچے پر پڑتی ہیں جس کی پتنگ کی ڈور کٹ چکی ہے۔ وہ ابھی تک رو رہا ہے۔ میں خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہوں اور اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو غور سے دیکھتا ہوں جو موٹے موٹے شیشوں والی اس کی عینک کی دوسری طرف دکھائی دے رہی ہیں۔ میں اس سے پوچھتا ہوں:

"کیا تم چاہو گے کہ میں تمھاری پتنگ کی ڈور دوبارہ باندھوں؟"

وہ میری طرف دیکھتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا:

"اگر تم چاہو تو میری تمھاری پتنگ بھی اڑا سکتا ہوں۔"

"کہاں تک؟ آپ کہاں تک اسے اڑا سکتے ہیں؟ کیا آپ اسے چنار کے درختوں کے اوپر تک اڑا سکتے ہیں؟"

''شاید۔شاید ایسا کرسکوں۔سچ کہوں تو جب میں تمھاری عمر کا تھا، ایسا کرسکتا تھا۔''

میں کاغذات کا لفافہ زمین پر ایک درخت کے نیچے رکھ دیتا ہوں اور اس سے پتنگ لے لیتا ہوں تاکہ اس کی ٹوٹی ہوئی ڈور دوبارہ باندھ سکوں۔نیلے رنگ کاغذ کے حلقوں سے بنے ہوئے پتنگ کے جھمکے اس کے دونوں طرف لٹکا کر پتنگ کی کاغذی دم کی گرہیں کھول دیتا ہوں۔درخت کی شاخوں کی طرف دیکھ کر ہوا کے رخ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔پارک تقریباً خالی ہے اور چند بچوں کے علاوہ دو چار بوڑھے مرد اور بوڑھی خواتین بھی پارک کے مختلف حصوں میں سیمنٹ کے بینچوں پر بیٹھے آپس میں بات کررہے ہیں۔میں اضافی دھاگے کو لکڑی کے ایک ٹکڑے کے گرد لپیٹتا ہوں تاکہ دوڑتے وقت دھاگہ دوبارہ ٹوٹ نہ جائے۔چھوٹا بچہ میرے کاموں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا ہے۔میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو ہم دونوں مسکرانے لگتے ہیں۔اس نے اپنی عینک اپنی گردن کے گرد لپیٹے ہوئے دھاگے سے باندھی ہے کہ گر نہ جائے۔اس کی شلوار کی جیب تھوڑی سی پھٹی ہوئی ہے اور ایک بٹن بھی غائب ہے۔

میں ایک دو میٹر دھاگہ کھول کر ہوا کے مخالف رخ دوڑنے لگتا ہوں۔وہ چھوٹا بچہ بھی میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔تھوڑی دور دوڑنے کے بعد پتنگ ہوا میں اڑنے لگتی ہے اور اس کی بادامی شکل وصورت زمین کے متوازی ہوجاتی ہے۔دوڑتے دوڑتے میں دھاگہ کچھ اور کھولتا ہوں اور اپنی رفتار بھی بڑھالیتا ہوں۔بچہ پیچھے رہ گیا ہے۔پتنگ کا سایہ زمین پر گرا ہوا ہے اور مجھے بے وقوفوں کی طرح یہ شوق چڑھ جاتا ہے کہ جہاں تک دھاگہ اجازت دے، اپنی پتنگ اور اوپر اڑاؤں۔پتنگ بھی اوپر جانے لگتی ہے۔سڑک کے انتہائی حصے پر پہنچ کر میں ڈور کو مزید چند میٹر ڈھیل دیتا ہوں۔اپنے ہاتھ کی ڈور ڈھیل دیتا اور دوبارہ کھینچتا ہوں تاکہ پتنگ اور اوپر اڑنے لگے۔میری سانسیں پھول رہی ہیں۔مجھے خیال آتا ہے کہ پتہ نہیں کتنا وقت ہے کہ میں اس طرح نہیں دوڑا۔میں باقی ڈور بھی آہستہ آہستہ کھول دیتا ہوں اور ہوا کو اس بات کی اجازت دے دیتا ہوں کہ وہ پتنگ کو پارک کے مشرقی حصے کی طرف اڑا لے جائے۔میں ڈور جتنی زیادہ کھولتا ہوں، پتنگ بھی اتنی ہی زیادہ چھوٹی دکھائی دینے لگتی ہے۔بچہ بھی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میرے پاس پہنچ جاتا

ہے اور دل کی گہرائیوں سے چلانے لگتا ہے: ''ہپ ہپ ہرے!'' میں پتنگ سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر ڈور اس کے حوالے کر کے کہتا ہوں کہ خیال کرے کہ ڈور نہ زیادہ زور سے کھینچے اور نہ اچانک پتنگ کو ڈھیل دے۔ میں اس کے لیے وضاحت کرتا ہوں کہ پتنگ کو اوپر روکے رکھنا اسے اڑانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

میں اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے کہتا ہوں کہ اب آہستہ آہستہ ڈور کو اور ڈھیل دے اور تاکہ جب تک ڈور اس کے ہاتھ میں ہے، میرے ہاتھوں کی حرکت دیکھ کر اچھی طرح پتنگ اڑانا سیکھ لے۔ بچہ اپنی پتنگ تھوڑی اور اوپر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر میں آرام سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے اٹھا لیتا ہوں تاکہ وہ خود ہی پتنگ ہوا میں اڑا سکے۔ ایک لمحے کے لیے میں آسمان میں اڑتی ہوئی پتنگ میں کھو جاتا ہوں اور پھر اس بچے کو گھورنے لگتا ہوں جو خوف کے عالم میں دھاگے کو کھینچتا اور رہا کرتا ہے۔ پھر پارسا کے نوٹس کے لفافے کی طرف بڑھتا ہوں۔

ابھی میں چند ہی قدم آگے بڑھا ہوں گا جب اس بچے کی خوشی بھری آواز پارک میں گونجتی ہے۔

میں مڑ کر نہیں دیکھتا لیکن جب بچہ چلاتا ہے: ''ہپ ہپ ہرے! بچو! آؤ دیکھو میری پتنگ آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ میری پتنگ خدا تک پہنچ گئی ہے۔''

تب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں، جہاں پتنگ خدا تک پہنچ چکی ہے۔

روی ماہ خداوند را ببوس

مصطفی مستور